گھڑی کا ہنگامہ
اشتیاق احمد
انسپکٹر جمشید سیریز

محمود، فاروق، فرزانہ

اور۔۔۔ انسپکٹر جمشید سیریز ۵۱

گھڑی کا ہنگامہ

اشتیاق احمد

Uploaded for:
www.urdufanz.com
By: SHJ3

اہتمام اشاعت

طاہر ایس ملک

پبلشر : ترتیب پبلشرز، لاہور۔
پرنٹر : عظیم علیم پرنٹرز، لاہور۔
قیمت : -/15 روپے۔

ترتیب پبلشرز

1- میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

دو باتیں

یہ گھڑی کا ہنگامہ ہے — اس سے پہلے بھی کئی ہنگامے آپ لوگوں کی نذر کر چکا ہوں — نہ صرف ہنگامے، بلکہ زلزلے اور منصوبے بھی — زندہ رہا تو ابھی کئی اور ہنگامے آپ تک پہنچاؤں گا۔ یہ زندگی بھی ایک ہنگامہ ہے — کیا کیا جائے، زندگی کے ہنگاموں سے بھاگ کر ہم جا بھی کہاں سکتے ہیں — ہاں کچھ دیر کے لیے ان ہنگامہ خیز ناولوں کی پناہ ضرور لے سکتے ہیں — آپ کہیں گے ہنگاموں سے بچنے کے لیے ہنگاموں کی پناہ، جی ہاں، کیوں نہیں۔ آپ نے سنا نہیں، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے — زہر کو زہر مارتا ہے۔

اس بار آپ کی یہ شکایت بھی رفع ہو جائے گی کہ ناول کم صفحات پر مشتمل تھا — یہ معمول سے بڑا ہو گیا ہے۔ کوشش کروں گا کہ اب ہر ناول ۴۴ صفحات سے کم کا نہ ہو، تاکہ کچھ تو آپ کا پیٹ بھرے — ایک تجویز یہ ہے کہ آپ تک ایک ساتھ چار ناولوں کی بجائے ہر ہفتے ایک ناول پہنچایا جائے تاکہ ہر ہفتے آپ لطف اندوز ہو سکیں — اس تجویز کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، ضرور لکھیے۔ کیونکہ میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے —

اشتیاق احمد

زوردار پروگرام

فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جمشید نے چائے کا کپ رکھ کر ریسیور اٹھایا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بیگم جمشید بدستور چائے پیتی رہیں۔ جیسے انہوں نے گھنٹی کی آواز سنی ہی نہ ہو۔

"ہیلو، جمشید بول رہا ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

"یار جمشید، میں نے ایک زوردار پروگرام بنایا ہے۔" دوسری طرف سے خان رحمان کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہائیں رحمان یہ تم ہو۔" انسپکٹر جمشید بھی خوش ہو کر بولے۔

"بھئی ظاہر ہے، فون پر میرے فرشتے تو ہو نہیں سکتے۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا، ایک عدد زوردار پروگرام کی۔ تم بھی اس پروگرام میں بیوی بچوں سمیت شریک ہو رہے ہو اور پروفیسر بھی شائستہ سمیت شامل ہوں گے۔"

"لیکن بھئی، پتا بھی تو چلے کہ پروگرام کیا ہے؟" ان کے بچے

میں حیرت تھی۔ خان رحمان کا نام سن کر محمود، فاروق اور فرزانہ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر ان کے کان کے قریب ہو گئے تھے۔ بیگم جمشید بھی اب فون پر ہونے والی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی تھیں۔

"بس میں نے کہا نا بہت زور دار پروگرام ہے۔" خان رحمان بولے۔

"آخر کتنا زور دار۔ اس طرح اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"سنو، ہم سب، یعنی میں اور میرے گھر کے سب افراد، ظہور سمیت۔ تم پانچوں اور پروفیسر صاحب اور شائستہ۔ سب کے سب پکنک منانے جائیں گے۔ جگہ کا انتخاب میں کر چکا ہوں، سونا جھیل، کیوں کیسا پروگرام رہے گا۔ کل چھٹی کا دن ہے، ہم صبح سویرے روانہ ہو جائیں گے اور تمام دن پکنک منائیں گے۔ ایئرگنیں بھی ساتھ ہوں گی اور مچھلی پکڑنے کا سامان بھی، جھیل سے مچھلیاں پکڑیں گے اور کچھ پرندے شکار کریں گے۔ ظہور مچھلی کے کباب اور پرندوں کا گوشت بھون کر دے گا اور ہم چٹخارے لے کر پکنک منائیں گے۔"

"پروگرام تو واقعی بہت زور دار ہے، لیکن اگر ظہور نے کباب اور گوشت جلا کر راکھ کر دیا تو؟"

"تو ہم اسے بھون کر کھا جائیں گے۔" خان رحمان نے بلند آواز میں کہا۔

"معاف کرنا بھئی، ہم آدم خور نہیں ہیں۔"

"اچھا بس، باتیں نہ بناؤ۔ یہ طے رہا کہ ہم اپنی کار میں فجر کی نماز پڑھ کر تمہارے گھر کی طرف روانہ ہوں گے، تم اپنی کار میں ہمیں تیار ملو گے۔ وہاں سے ہم پروفیسر صاحب کی طرف روانہ ہوں گے جو شائستہ کے ساتھ اپنی کار میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تمام ضروری سامان میں لے کر چلوں گا۔ اس سلسلے میں تم لوگوں کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"تو کیا تم پروفیسر صاحب سے بات کر چکے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، پہلے میں نے تمہیں فون کیا ہے۔ اب انہیں کروں گا۔"

"بہتر ہے۔ پہلے ان سے بات کر لو۔ کیا خبر وہ جانے پر تیار ہوں یا نہ ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"تیار کیسے نہ ہوں گے۔ میں پروگرام بناؤں اور وہ ساتھ نہ دیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" خان رحمان نے بارعب لہجے میں کہا۔

"بھئی، کئی ایسی باتیں ہو سکتی ہیں، جن کی بنا پر پروفیسر صاحب ہمارے ساتھ نہ جا سکیں۔"

"تم فکر نہ کرو، میں ان کی ایک نہ چلنے دوں گا۔" خان رحمان نے ہنس کر کہا اور سلسلہ کاٹ دیا۔

"لو بھئی، پکنک منانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"ایسے کاموں کے لیے تو ہم تیار ہی رہتے ہیں ابا جان۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ہمارے انکل بھی کتنے مزے کے آدمی ہیں۔ ایسے ایسے لذیذ پروگرام بناتے ہیں کہ منہ میں پانی بھر آتا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"شاید تمہاری رال ٹپک رہی ہے۔" محمود جل کر بولا۔

"اور انکل کو مزے کے آدمی تو اس طرح کہہ رہے ہو، جیسے وہ کوئی کھانے کی چیز ہوں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"تم دونوں کا مجھ سے لڑ بیٹھنے کا ارادہ ہو تو پہلے ہی بتا دو، تاکہ میں تیاری کر لوں — ویسے اگر یہ لڑائی تم پکنک کے موقعے تک کے لیے اٹھا دو تو مناسب رہے گا۔"

"کیوں، کیا سب کے سامنے اپنی مرمت کرانا چاہتے ہو؟" فرزانہ بولی۔

"یہ تو سب کے سامنے ہی پتا چلے گا۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی — انسپکٹر جمشید نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے پروفیسر داؤد کی پریشان آواز سنائی دی:

"یار جمشید، مجھے خان رحمان سے بچاؤ۔"

"جی، کیا مطلب؟" ان کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"میں ان دنوں بہت مصروف ہوں — تجربہ گاہ چھوڑ کر چند منٹ کے لیے بھی کہیں نہیں جا سکتا — اور ادھر یہ خان رحمان مجھے پکنک پر گھسیٹ لے جانا چاہتے ہیں؛ حالانکہ میں نے بتا دیا ہے کہ میرا جانا تقریباً ناممکن ہے، ہاں شائستہ کو شوق سے لے جاؤ۔ لیکن وہ خان رحمان ہی کیا جو ٹس سے مس ہو جائے اور جس کے کان پر جوں رینگ جائے۔ تم ہی کچھ کرو۔"

"کیا آپ ان دنوں کسی خاص ایجاد کے سلسلے میں مصروف ہیں؟"

"ہاں، یہی سمجھ لو۔ میں کام کی تفصیل کسی کو نہیں بتا سکتا۔ صدرِ مملکت کی ہدایات یہی ہیں۔"

"اوہو، معلوم ہوتا ہے بہت ہی خاص نوعیت کی چیز ایجاد کرنے کی فکر میں ہیں، لیکن الجھن یہ ہے کہ خان رحمان کو سمجھانا بھی دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔"

"بھئی تم اس سے کہو گے تو وہ مان جائے گا۔"

"اچھا، میں ان سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے دوسری طرف سے سلسلہ بند ہونے کا انتظار کیا اور پھر ریسیور رکھے جانے کی آواز سن کر خان رحمان کے نمبر ڈائل کیے — دوسری طرف سے فوراً ہی خان رحمان کی آواز سنائی دی:

"میں جانتا ہوں، تم نے کیوں فون کیا ہے، لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں — پروفیسر پکنک پر ضرور جائیں گے۔"

"لیکن بھئی، وہ بہت مصروف ہیں — کسی خاص ایجاد کے چکر میں ہیں۔"

"ہوں گے۔ انہیں پکنک پر جانا ہوگا۔"

"لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کا جانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں جمشید، اس بات کو تو تم بھی مانتے ہو
نہ ہونا۔"

"ہاں" ان کے منہ سے نکلا۔

"تو بس پھر، تم پروفیسر صاحب سے کہہ دو کہ خان رحمان نہیں
مانتا۔" یہ کہہ کر خان رحمان نے ریسیور رکھ دیا۔ انسپکٹر جمشید بیچارگی
کے عالم میں پروفیسر داؤد کے نمبر گھمانے لگے۔

⊙

دوسرے دن صبح سویرے تین کاریں سونا جھیل کی طرف رواں دواں
تھیں۔ سب سے اگلی کار میں پروفیسر داؤد، شائستہ اور محمود بیٹھے تھے
پروفیسر داؤد بُرے بُرے منہ بناتے ہوئے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔
ان کے پیچھے انسپکٹر جمشید کی کار تھی۔ ان کے ساتھ بیگم، فاروق اور فرزانہ
تھے۔ خان رحمان سب سے آخر میں تھے۔ اپنے تینوں بچوں، بیگم اور
ظہور کے ساتھ۔ آگے چلنا انہوں نے اس لیے منظور نہیں کیا تھا کہ
کہیں پروفیسر داؤد فرار نہ ہو جائیں۔

سونا جھیل شہر سے صرف تین میل دور تھی اور سرحد کے بالکل

قریب تھی۔ سونا جھیل سے چند میل آگے سرحد پر کھڑے فوجی جوان دیکھے
جا سکتے تھے اور دوسری طرف دشمن ملک کے فوجی بھی ٹہلتے نظر آ
رہے تھے۔ یہ مقام ایک پُرفضا مقام کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔
یہاں لوگ گروہوں کی صورت میں پکنک منانے آتے تھے۔ جھیل کے
نیچے پانی پر کشتی رانی بھی کرتے، مچھلیاں بھی پکڑتے اور پرندوں کا
شکار بھی کھیلتے۔ یہاں شکار پر کوئی پابندی نہیں تھی، لیکن جب وہ
جھیل پر پہنچے تو یہ دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی کہ آج ان کے
علاوہ یہاں اور کوئی نہیں پہنچا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے، ہم بہت سویرے یہاں آ گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید
بولے۔

"لیکن پکنک منانے والی پارٹیاں تو یہاں منہ اندھیرے پہنچنا
شروع ہو جاتی ہیں۔ میں کئی مرتبہ بچوں کو لے کر یہاں آ چکا ہوں۔"
خان رحمان بولے۔

"بھئی اس میں عجیب بات کیا ہے۔ ہو سکتا ہے آج ہمارے
علاوہ کسی نے ادھر آنے کا پروگرام نہ بنایا ہو۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ٹھیک ہے، ہمیں اس سے کیا، کوئی آئے نہ آئے۔" خان
رحمان بولے۔

انہوں نے کاریں جھیل سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دیں۔ سب سے
پہلے مچھلی کے شکار کی ٹھہری، کیونکہ صبح سویرے مچھلیاں ذرا آسانی سے

لگ جاتی ہیں۔ بیگم جمشید اور شہناز بیگم کو مچھلی کے شکار سے چونکہ کوئی
دلچسپی نہیں تھی، اس لیے دونوں ٹہلنے کے انداز میں ایک سمت میں
چل پڑیں — دونوں باتیں بھی کر رہی تھیں — انہیں جاتے دیکھ کر
خان رحمان پکارے:

"یہ تم دونوں کہاں فرار ہونے کی تیاریاں کر رہی ہو۔ جونہی
ہم میں سے کسی کے کانٹے میں کوئی مچھلی لگی، کباب تلنے کا کام شروع
ہو جائے گا۔"

"ہم جانتے ہیں، اتنی جلدی آپ میں سے کسی کے کانٹے میں
مچھلی نہیں لگے گی۔" شہناز بیگم نے مسکرا کر کہا۔ "اور پھر ظہور جو یہاں موجود
ہے۔"

"پھر بھی تمہیں جھیل کے آس پاس رہنا چاہیے۔" خان رحمان
نے آواز لگائی۔

"آپ فکر نہ کریں، ہم اتنی دور نہیں جائیں گی کہ واپس پہنچنے تک
شکار کی ہوئی مچھلیاں سوکھ کر کانٹا ہو جائیں۔" بیگم جمشید نے ہنس کر کہا۔

"ویری گڈ بھابی، آپ کا جملہ پسند آیا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"شکریہ پروفیسر صاحب، مجھے حیرت ہے، آپ بھی یہاں آنے پر
مجبور ہو گئے۔" بیگم جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"یہ جو خان رحمان ہیں نا، اپنے آگے کسی کی نہیں چلنے دیتے۔"
پروفیسر داؤد نے معصوم صورت بنا کر کہا۔

اچانک حامد کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی، وہ دھڑام سے پانی میں
گرا تھا — سب ایک دم اس کی طرف مڑے۔

"بچ — بچاؤ۔" اس نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"ارے، اسے کیا ہوا؟" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا، ساتھ ہی
انہوں نے کپڑوں اور جوتوں سمیت پانی میں چھلانگ لگا دی — اتنا وقت
کہاں تھا کہ وہ جوتے اتار سکتے — خان رحمان چھلانگ لگاتے لگاتے رہ
گئے — اتنی دیر میں حامد ایک بار مکمل طور پر ان کی نظروں سے اوجھل ہو
چکا تھا، لیکن فوراً ہی پھر ابھر آیا تھا — اگرچہ حامد کو تیرنا آتا تھا لیکن
نہ جانے اسے اس وقت کیا ہو گیا تھا — تیزی سے ہاتھ پیر چلاتے
انسپکٹر جمشید اس تک پہنچ گئے اور ایک بازو اس کی کمر کے گرد ڈال کر جو
کنارے کی طرف مڑے، تو انہیں ایسے محسوس ہوا، جیسے کوئی طاقت انہیں
پانی میں کھینچ رہی ہے — انہوں نے زور لگایا تو حامد ہاتھ سے نکلتا
محسوس ہوا — اب تو وہ پریشان ہو گئے، چلا کر بولے:

"خان رحمان، حامد کو پانی میں کسی چیز نے پکڑ رکھا ہے۔ وہ اسے
نیچے کی طرف کھینچ رہی ہے، وہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے — میں
اسے کھینچ نہیں پا رہا ہوں — فوراً کوئی رسی یا کسی درخت کی شاخ
مجھ تک پہنچاؤ، تاکہ اس کا ایک سرا ہی پکڑ لوں اور تم لوگ مل کر
ہمیں کھینچ سکو۔"

خان رحمان جھولنے کے لیے نائیلون کی رسی بھی ساتھ لائے تھے:

چنانچہ وہ اپنی کار کی طرف دوڑے — رسی کنارے تک لانے میں انہیں ک
دیر نہ لگی — اس دوران انسپکٹر جمشید برابر زور لگاتے رہے تھے — ان ک
زور لگانے کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ حامد کا منہ پانی سے او
رہا تھا — خان رحمان نے رسّی کا ایک سرا انسپکٹر جمشید کی طرف اُچھال د
انہوں نے پھرتی سے اسے پکڑ لیا — اب کنارے پر موجود سب لوگوں
مل کر اس کو کھینچنا شروع کیا — انسپکٹر جمشید اور حامد کنارے کی طرف
کھینچنے لگے — اور پھر انہیں ایک شدید جھٹکا لگا — انسپکٹر جمشید نے محسو
کیا کہ اس چیز نے حامد کو چھوڑ دیا ہے — جھٹکا لگنے کی یہی وجہ تھی۔ ا
وہ دونوں نہایت تیزی سے کنارے کی طرف لپکے — خان رحمان اور دوسرو
نے انہیں پکڑ کر کنارے پر کھینچ لیا اور پھر ان کے منہ سے نکلنے وال
چیخوں نے فضا کو تھرا دیا۔

حامد کی دائیں پنڈلی کا گوشت جگہ جگہ سے اُتر چکا تھا۔

وہ کیا چیز تھی؟

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے — وہ بُتوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے — پھر شہناز بیگم نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"اُف میرے خدا، یہ کیا ہوا؟"

ان کی آواز جیسے سب کو ہوش میں لے آئی — انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی حامد کی ٹانگ پر کپڑا لپیٹا اور اسے اٹھا کر کار کی طرف دوڑے — دوڑنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بلند آواز میں کہا:

"سب لوگ میرے ساتھ آئیں — محمود، فاروق تم دونوں یہیں رہو گے۔ کسی کو جھیل کی طرف نہ آنے دینا۔"

وہ جلدی جلدی کاروں میں بیٹھے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"یار، یہ کیا ہوا؟" محمود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا — یہ جھیل تو بالکل بے ضرر ہے۔ لوگ عام طور پر یہاں آتے رہتے ہیں، اس میں نہاتے ہیں — کشتیاں چلاتے ہیں اور مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں، پھر آخر وہ کیا چیز تھی، جس نے حامد کی ٹانگ۔

چہائی" فاروق نے پریشان لہجے میں کہا۔

"اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حامد جھیل میں کس طرح گر گیا۔ وہ تو چھڑی پکڑے — کانٹا پانی میں ٹکائے بیٹھا تھا۔" محمود نے کہا۔

"کیوں نہ ہم پھر کانٹے ڈال کر بیٹھ جائیں — ذرا دیکھیں تو سہی کیا ہوتا ہے — فاروق نے تجویز پیش کی۔

"میرا خیال ہے، یہ بہت خطرناک ہوگا۔" محمود نے کہا۔

"بھئی حامد بے خبر تھا — ہم ہوشیار ہو چکے ہیں — کانٹوں پر اپنی گرفت مضبوط نہیں رکھیں گے۔" فاروق بولا۔

"خیر، یونہی سہی، لیکن اگر ہمیں کچھ ہوا تو اس کی ذمے داری تم پر ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے۔"

دونوں نے چارا کانٹوں میں لگایا اور نزدیک نزدیک کانٹے ڈال کر بنسیاں پکڑ کر بیٹھ گئے — محمود نے بنسی دائیں ہاتھ میں اور فاروق نے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی — خالی ہاتھوں سے انہوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا، تاکہ ایک گرنے لگے تو دوسرا سنبھال لے —

کافی دیر گزر گئی — ان کے کانٹوں پر نہ تو کوئی مچھلی لگی اور نہ ان میں سے کسی کو جھٹکا لگا — دوسری طرف انہیں اپنے والد اور فرزانہ کا انتظار تھا۔ انہیں واپس ضرور آنا تھا۔ اچانک شڑاپ کی آواز سنائی

دی اور اگر محمود نے اپنی بنسی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہوتا تو وہ یقیناً جھیل میں جا گرا ہوتا — کیونکہ اچانک بنسی کو کسی چیز نے پورے زور سے کھینچا تھا۔ اب محمود کا ہاتھ خالی تھا؛ البتہ فاروق کے ہاتھ میں بنسی ابھی تک موجود تھی —

"لو بھئی، میری بنسی تو گئی۔"

"خدا کا شکر ہے، جس نے ابھی تک میری بنسی کو محفوظ رکھا۔" فاروق بولا:

"معلوم ہوتا ہے، اس جھیل میں کوئی خطرناک چیز آ گئی ہے۔" محمود نے کہا —

"لیکن کہاں سے آ گئی ہے — اس جھیل میں تو صرف بارش کا پانی ہوتا ہے، بارش کا پانی اس میں سارا سال رہتا ہے، ہاں سیلابوں کے دنوں میں دریا کا پانی بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس دوران ضرور کوئی خطرناک چیز جھیل میں شامل ہو سکتی ہے — سیلاب آج سے آٹھ ماہ پہلے آیا تھا — اگر اس دوران اس میں کوئی خطرناک چیز شامل ہو چکی ہے تو اس کی خبر تو بہت پہلے پھیل جانا چاہیے تھی، لیکن ہم نے ایسی کوئی خبر نہیں سنی، اور میرا خیال ہے، کسی نے بھی نہیں سنی — سنی ہوتی تو لوگوں کی آمد یہاں بند ہو جاتی۔"

"لیکن آج کوئی اور پارٹی یہاں —" محمود کے الفاظ درمیان میں رہ گئے — اسی وقت انہوں نے ایک کار کو موڑ مڑتے ہوئے دیکھا۔

دونوں کی نظریں سبز رنگ کی اس بڑی سی کار پر جم گئیں اور پھر وہ
جھیل کے قریب آکر رُک گئی۔ اس میں سے دو مرد دو عورتیں اور تین
بچے اترے ۔۔ بچوں میں دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا ۔۔ ان کے
ہاتھوں میں مچھلی کا شکار کھیلنے کا سامان تھا ۔۔ انہیں کار سے اتر کر
جھیل کی طرف بڑھتے دیکھ کر محمود چند قدم آگے بڑھ آیا اور بولا :

"نہیں جناب، آپ اس جھیل پر مچھلی کا شکار نہیں کھیل سکتے۔"

"کیا مطلب ! اس جھیل پر تو شکار کی کوئی پابندی نہیں ہے۔"
ایک مرد نے حیران ہو کر کہا۔

"بے شک پابندی نہیں، لیکن تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں ایک
حادثہ ہو چکا ہے اور اس حادثے کے بعد یہ کسی طرح بھی مناسب
نہیں کہ یہاں شکار کھیلا جائے۔" محمود نے کہا۔

"کیسا حادثہ ؟" دوسرا مرد بولا۔

محمود نے انہیں تفصیل سُنا دی ۔۔ وہ غیر یقینی کیفیت میں حادثے
کی تفصیل سُنتے رہے اور پھر ایک عورت ہنس کر بولی :

"تم دونوں شاید مذاق کر رہے ہو ۔۔ یا پھر بہروپیے ہو اور
ہمیں ڈرا کر کچھ پیسے حاصل کرنا چاہتے ہو ۔۔ یہاں تو ہم اکثر شکار
کھیلنے آتے ہیں۔ آج تک کچھ نہیں ہوا۔"

"خود ہم بھی آتے رہے ہیں محترمہ، لیکن اس قسم کا حادثہ آج ہی
پیش آیا ہے۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہم پکنک منانے آئے ہیں، پکنک منا کر ہی جائیں گے۔" ایک
مرد نے اٹل لہجے میں کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی ۔۔ ہمارا کام تھا آپ کو خبردار کر دینا، سو
ہم کر چکے ہیں ۔۔ اب اگر کوئی حادثہ پیش آیا تو اس کی ذمے داری
خود آپ پر ہو گی۔"

"ٹھیک ہے، شکریہ۔" ایک عورت نے لاپروائی سے کہا اور پھر
وہ پانچوں بنسیاں تھام کر جھیل کے کنارے بیٹھ گئے ۔۔

"خدا کے لیے بنسیوں کو مضبوطی سے پکڑ کر نہ بیٹھیے گا ۔۔ انہیں
ڈھیلے ہاتھوں سے پکڑے رہیے گا۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی ہاں، کیوں کہ اس حادثے کے بعد ہم نے بھی تجربہ کیا ہے
اور ایک بنسی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔"

"تم لوگ ہمیں بلا وجہ ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔" اس بار
لڑکا بولا تھا۔

"اچھا، خدا آپ لوگوں کو سمجھ عطا فرمائے۔" فاروق نے تنگ آ کر
کہا۔

"شکریہ۔" وہ ایک ساتھ بولے۔

محمود اور فاروق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی
اشاروں میں یہ فیصلہ کیا کہ اگرچہ ان لوگوں نے ان کی بات پر کان نہیں
دھرے، پھر بھی وہ اُن کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کریں گے ۔۔ یہ

سوچ کر وہ ان کے پیچھے چاق و چوبند ہو کر کھڑے ہو گئے — ان کا اس
طرح کھڑا ہونا بھی اس پارٹی کو ناگوار گذرا — ایک مرد نے تنک کر کہا:
"آخر تم لوگ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔"
"اس لیے کہ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔"
اچانک شڑاپ کی آواز سنائی دی — لڑکے کے منہ سے چیخ نکلی
اس کے قدم اکھڑ گئے — پھر اس سے پہلے کہ وہ پانی میں جا گرتا
محمود اور فاروق نے اپنی جگہ سے چھلانگیں لگائیں اور اُسے دبوچ لیا۔
"کیا ہوا عامر؟" ایک لڑکی چیخی۔
"مم — میری بنسی کو کسی نے پکڑ کر زور سے کھینچا تھا" لڑکے نے
ہانپتے ہوئے کہا — اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی جا رہی تھیں۔
"ضرور تمہیں وہم ہوا ہے۔"
"نہیں نہیں، ان دونوں کا بیان بالکل درست ہے — خدا کے
لیے بنسیاں پانی سے نکال لو" عامر نامی لڑکے نے ڈرے ڈرے
انداز میں کہا۔

اس کا سہما ہوا لہجہ ان پر اثر انداز ہونے لگا اور انہوں نے
آہستہ آہستہ بنسیاں نکال لیں — عامر کا رنگ بالکل زرد تھا اور وہ لمبے
لمبے سانس لے رہا تھا — کئی سیکنڈ گزرنے کے بعد اس نے کہا:
"اُف میرے خدا، اگر یہ دونوں مہربان یہاں نہ ہوتے تو اس
وقت میرا نہ جانے کیا حال ہوتا۔"

"مگر ہمارے نام مہربان نہیں ہیں۔" فاروق نے گھبرا کر کہا اور وہ
مسکرا اُٹھے —
اسی وقت ایک کار کے ہارن کی آواز سنائی دی — انہوں نے
چونک کر ادھر دیکھا — کار میں ان کے والد اور فرزانہ تھے — اُن کے پیچھے
پولیس کی تین جیپیں تھیں — چند لمحوں بعد وہ سب کار اور جیپوں سے
اُتر کر جھیل کی طرف بڑھ رہے تھے — عامر اور اس کے ساتھی حیران
اور پریشان حالت میں انہیں دیکھ رہے تھے — نزدیک آتے ہی انسپکٹر
جمشید بولے:
"ہمارے جانے کے بعد تو کچھ نہیں ہوا؟"
"جی ہاں، میں نے اور فاروق نے تجربے کے طور پر بنسیاں لٹکائی
تھیں اور انہیں ڈھیلے ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میری
بنسی کو کسی چیز نے پکڑ کر کھینچا — اگر بنسی ڈھیلے ہاتھ سے نہ پکڑی ہوتی
تو اس وقت میں بھی حامد سے مختلف حالت میں نہ ہوتا — پھر یہ لوگ
یہاں پہنچے — انہوں نے شکار کھیلنا چاہا — ہم نے انہیں خبردار کیا، لیکن
یہ نہ مانے اور بنسیاں لٹکا کر بیٹھ گئے — ہم ان کے لیے فکرمند تھے،
اس لیے ان کے عین پیچھے کھڑے ہو گئے۔ آخر ان میں سے بھی ایک
پانی میں گرنے لگا، لیکن ہم نے اسے پکڑ لیا — یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے
کی بات ہے۔" محمود نے تفصیل سے بتا دیا۔
"ہوں، اس کا مطلب ہے، جھیل میں ضرور کوئی خطرناک چیز ہے —

خبر پولیس کے نوجوان ہیں ساتھ لے آیا ہوں۔ یہ ایک بڑا جال بھی ساتھ
لائے ہیں۔ ساتھ رائفلیں بھی لائے ہیں — جوں ہی یہ اس خطرناک چیز کو
دیکھیں گے، اس پر فائرنگ کر دیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک بہت بڑا جال جھیل میں پھینکا گیا اور اُسے
آہستہ آہستہ کھینچا جانے لگا — جال کھینچنے والوں میں سے ایک نے پُرجوش
لہجے میں کہا —

"جال بہت وزنی ہو گیا ہے، ضرور اس میں وہ چیز پھنس گئی
ہے۔"

"یہ سُن کر رائفل بردار کانسٹیبلوں نے اپنی رائفلیں تان لیں اور فائر
کرنے کے لیے تیار ہو گئے — باقی کانسٹیبل مل کر جال کھینچ رہے تھے۔
آہستہ آہستہ جال میں مچھلیاں پھنسی نظر آنے لگیں۔ ان کی نظریں کسی بڑی
چیز کو تلاش کرنے لگیں اور پھر اچانک ان کی آنکھیں خوف اور دہشت
سے پھیل گئیں —

○

انہوں نے دیکھا، جال میں چھوٹی بڑی مچھلیوں کے ساتھ ایک انسانی
لاش بھی پھنسی ہوئی تھی — اس کے جسم کا سارا گوشت کھایا جا چکا تھا،
بس صرف ہڈیاں ہی باقی تھیں، یا پھر کھوپڑی کے اوپر بال موجود تھے —

یہ دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے — ایک جگہ سے جال کٹا ہوا
نظر آیا — جال کو باہر کھینچ لیا گیا۔ اس میں سے انسانی لاش نکال لی
گئی — مچھلیاں ایک طرف ڈھیر کر دی گئیں — انسپکٹر جمشید کٹے ہوئے حصے
پر جھک گئے۔ انہوں نے ڈوریاں آپس میں ملانے کی کوشش کی،
لیکن یہ ممکن نہ ہوا — ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے جال کا کچھ حصہ نوچ لیا
گیا ہو —

"صاف ظاہر ہے، اس بلا نے جال کاٹ دیا ہے اور اس میں سے
نکل گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے —

"پھر اب کیا کریں؟" محمود بولا —

"ہم ایک اور جال منگوائیں گے، جو نائیلون کی مضبوط ڈوریوں کا ہو گا۔"
انہوں نے کہا اور پھر سب انسپکٹر کو جال کے بارے میں ہدایات دینے لگے۔
ہدایات ذہن نشین کرنے کے بعد سب انسپکٹر ایک کانسٹیبل کے ساتھ روانہ ہو
گیا — اور انسپکٹر جمشید لاش کی طرف متوجہ ہوئے — محمود، فاروق اور فرزانہ
بھی لاش کا بغور جائزہ لینے لگے۔ لیکن دیکھا جائے تو جائزہ لینے والی
اب بات ہی کیا رہ گئی تھی۔ وہاں ہڈیوں کے سوا رہ ہی کیا گیا تھا۔ چہرے
پر بھی صرف جبڑے کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں، یا پھر اوپر نیچے کے دانت۔
سر کے بال البتہ ضرور موجود تھے — اور یہ سنہری رنگ کے تھے — لاش کا
دایاں بازو کمر کے نیچے دب گیا تھا، اس لیے ابھی تک وہ اس کا بازو نہیں
دیکھ سکے تھے —

"محمود، ذرا اسے پلٹنا" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہیں پلٹوں" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، محمود تمہارا ہی نام ہے" فاروق جلدی سے بولا۔

"ابا جان، آپ یہ کام فاروق سے نہیں لے سکتے"

"نہیں، اس لیے کہ تم ان کی نسبت زیادہ دلیر اور زیادہ طاقتور ہو" انہوں نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو یہ لیجیے" یہ کہہ کر اُس نے لاش کو پلٹ دیا۔

"ابا جان بھی کمال کے آدمی ہیں۔ محمود کی تعریف کر کے لاش پلٹوا لی" فاروق ہنسا۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ محمود تم دونوں کی نسبت زیادہ دلیر اور طاقت ور ہے" انسپکٹر جمشید سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"خیر ہوگا، مانے لیتے ہیں" فرزانہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"بھئی، اس میں مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ چلو ہیں کم دلیر اور کم طاقت ور سہی" محمود نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

انسپکٹر جمشید اب لاش کے دوسرے حصے کا جائزہ لے رہے تھے۔ دائیں ہاتھ کی کلائی پر انہیں ایک گھڑی نظر آئی۔ انہوں نے دیکھا، گھڑی بند تھی۔ یہ ایک سنہری ڈائل کی بڑی سی گھڑی تھی۔

"لو بھئی، لاش پر گوشت تو نہیں بچ سکا، یہ گھڑی ضرور بچ گئی ہے۔

شاید اسی سے کچھ معلوم ہو سکے کہ یہ بدنصیب کون تھا" انہوں نے کہا اور گھڑی کلائی پر سے اتار لی۔ گھڑی کے نیچے کلائی پر گوشت موجود تھا۔

"اس جگہ کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ لاش ایک گورے رنگ کے آدمی کی ہے" یہ کہہ کر انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس پر صرف ایک دن پہلے کی تاریخ تھی۔ گھڑی کی سوئیاں پونے چار بجا رہی تھیں اور دن جمعرات کا تھا؛ گویا یہ شخص کل شام پونے چار بجے حادثے کا شکار ہوا تھا۔

"آج کے اخبارات میں اس کی گم شدگی کی خبر ضرور آئی ہوگی۔ ہمیں تمام اخبارات پڑھنا پڑیں گے، تاکہ اس کے گھر والوں کو اطلاع دی جا سکے"

تھوڑی دیر بعد سب انسپکٹر نیا جال لے کر آ پہنچا۔ کانسٹیبلوں نے ایک بار پھر جھیل میں جال پھینکا اور پھر اُسے کھینچنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا، کوئی چیز جال کو پانی کی طرف کھینچنے کے لیے زور لگا رہی ہے۔ کانسٹیبلوں نے اور زور لگایا۔ آخر کار وہ جال کو کھینچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کوئی چیز زور شور سے تڑپ رہی تھی۔ انسپکٹر جمشید نے پولیس والوں کو رائفلیں چلانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اس چیز کو خود دیکھنا چاہتے تھے اور پھر ان سب کی سٹی گم ہو گئی۔ جال میں ایک بہت بڑا مگرمچھ موجود تھا۔ وہ منہ کھولے جال کو کاٹنے میں مصروف تھا۔

مچھلیوں میں بُری طرح کھلبلی مچی ہوئی تھی — ایک تو انہیں پانی نہیں مل رہا تھا، دوسرے مگرمچھ کی دہشت — نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد مچھلیاں بے دم ہوگئیں ؛ البتہ مگرمچھ اسی طرح منہ کھولے جال سے جنگ کرتا رہا، لیکن شاید یہ جال بہت ہی خاص قسم کا تھا کہ وہ اسے کاٹ نہ سکا —

"میں اسے زندہ گرفتار کروں گا — یہ ہمارے شہر کے چڑیا گھر کے کام آئے گا" اچانک انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"لیکن ابا جان، یہ بہت خطرناک کام ہوگا" فرزانہ نے کانپ کر کہا —

"تم فکر نہ کرو" یہ کہہ کر انہوں نے ایک کانسٹیبل سے رائفل لے لی اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کر آگے بڑھے۔ مگرمچھ نے بھی انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا — وہ منہ کھولے ان کی طرف پلٹا — اسی وقت انسپکٹر جمشید نے رائفل کا کندہ اس کے منہ میں گھسیڑ دیا اور آگے دھکیلتے چلے گئے۔ مگرمچھ بلبلا اٹھا — اس نے پہلے تو اپنی دم کو پورے زور سے پٹخا، پھر ایک پلٹنی کھائی — اگر انسپکٹر جمشید نے رائفل کی نالی کو ایسے میں مضبوطی سے پکڑ رکھا ہوتا تو پھر وہ بھی پلٹنی کھا جاتے، لیکن نالی ان کے ہاتھوں میں گھوم کر رہ گئی — انہوں نے اور زور سے نالی کو اندر دھکیل دیا — مگرمچھ نے تڑپ کر کندے کو باہر نکال دینے کی پوری کوشش کی، لیکن ممکن نہ ہوا — سب لوگ سانس روکے

کھڑے تھے — اگر مگرمچھ جال سے باہر ہوتا تو اس وقت لڑائی کا منظر اور بھی دہشت ناک ہوتا — آخر تقریباً دس منٹ بعد مگرمچھ نے ہمت ہار دی — اور وہ بے دم ہوکر گر پڑا — انسپکٹر جمشید اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ آئے اور کانسٹیبلوں نے اسے جال میں لپیٹ لیا —

"عجیب بات ہے" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے —

"جی، عجیب بات — لیکن ہمیں تو یہاں دور دور تک عجیب بات نظر نہیں آئی" فاروق نے حیران ہوکر کہا —

تمہاری نظر کمزور ہوگئی ہے، نظر کیسے آئے" فرزانہ بول اُٹھی —

عجیب بات یہ ہے کہ سیلاب تو اب سے کئی ماہ پہلے آیا تھا، پھر ان دنوں جھیل میں مگرمچھ کہاں سے آگیا"

"ہوسکتا ہے، انہی دنوں آیا ہو"

"تو پھر آج سے پہلے ہم نے اس کے بارے میں کیوں نہیں سُنا — اس بدنصیب آدمی کو بھی حادثہ ابھی کل ہی پیش آیا ہے، گھڑی پر کل کی تاریخ ہے۔ جب کہ یہاں لوگ ہر روز ہی تفریح کے لیے آتے ہیں۔ آخر آج اور کل سے پہلے اس مگرمچھ نے کسی پر کیوں حملہ نہیں کیا جب کہ آج تھوڑی دیر کے اندر اس نے کئی بار حملہ کیا"

"یہ تو آپ اس مگرمچھ سے ہی پوچھیے" فاروق بولا۔

"احمق ہو تم، اس سے کس طرح پوچھ سکتے ہیں۔ وہ تو بیہوش ہوچکا ہے" فرزانہ نے جلدی سے کہا —

"دھت تیرے کی — ان حالات میں تو اپنی زبانوں کو روک لو۔"
محمود نے جھلا کر کہا، پھر انسپکٹر جمشید کی طرف مڑا :

"ابا جان، آپ نے حامد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"بتانے کا وقت ہی کہاں ملا ہے — وہ بے چارہ اب تک بے ہوش ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کی ٹانگ پر پٹی کر دی ہے اور اس کی حالت کو خطرے سے باہر بتایا ہے — خان رحمان، سرور، ناز، پروفیسر داؤد اور شائستہ سب ہسپتال میں موجود ہیں۔"

"ویسے ابا جان، آپ نے جو بات بتائی ہے، ہے وہ سو فی صد عجیب — میں اس پر جتنا غور کر رہی ہوں، اس میں تعجب کا پہلو بڑھتا ہی جاتا ہے۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں — آخر یہ مگرمچھ اتنا عرصہ کہاں رہا؟ اس نے کسی اور پر حملہ کیوں نہ کیا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہو سکتا ہے، یہ مگرمچھ آدمیوں کی طرح عقل رکھتا ہو۔" فاروق نے کہا۔

"تم خاموش نہیں رہ سکتے۔"

"جی، بالکل رہ سکتا ہوں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں، اس جھیل پر اب پابندی عائد کر دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور مگرمچھ کسی طرح اس جھیل میں آجائے اور بنی نوع انسان کو اپنا نشانہ بنانا شروع کر دے۔"

"کیا آپ یہ اندازہ لگا چکے ہیں کہ جھیل میں مگرمچھ آ کس طرح گیا؟"

"نہیں، اس بات پر مجھے بہت حیرت ہے — یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سیلاب کے زمانے میں مگرمچھ جب اس جھیل میں پہنچا، بہت چھوٹا تھا — یہ بہت بڑا ہے اور اس نے لوگوں پر حملہ ابھی کل شروع کیا ہے — آخر کل سے پہلے ایسا کوئی حادثہ کیوں نہیں ہوا؟"

"گویا آپ کا خیال یہ ہے کہ مگرمچھ ابھی ایک دو دن پہلے ہی اس جھیل میں پہنچا ہے۔" فرزانہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں یہی سمجھتا ہوں۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" محمود بولا۔

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ یہ لاش کس بدنصیب کی ہے — اس کے گھر والوں کو اس کی گمشدگی کی اطلاع ہے یا نہیں — اگر یہ شخص اپنے گھر والوں کو یہ بتا کر آیا تھا کہ وہ سونا جھیل کی طرف جا رہا ہے تو اس کے گھر والے اسے تلاش کرنے ادھر کیوں نہیں آئے — آئے تھے تو انہوں نے کیا کیا؟"

تھوڑی دیر بعد روانگی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی — لاش اور مگرمچھ کو ایک جیپ کے پچھلے حصے میں بند کر دیا گیا اور پھر وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے — شہر پہنچ کر سب سے پہلے انہوں نے چڑیا گھر

کے حکام کو فون کیا۔ وہ مگرمچھ کی اطلاع سُن کر دوڑے آئے ۔
چڑیا گھر کا منتظم مگرمچھ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس نے کہا :

"اس قسم کے مگرمچھ دریائے ایمیزن میں پائے جاتے ہیں ۔ یہ
بہت خطرناک ہوتے ہیں، انسان کی بُو پا کر فوراً حملہ کرتے ہیں۔
کئی کئی ماہ بغیر کھائے پیے بھی زندہ رہ سکتے ہیں ۔ یعنی اگر انہیں
کسی کمرے میں بند کر دیا جائے تو کئی ماہ بعد یہ خوراک کے بغیر
زندہ ملیں گے ۔ یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں ان میں ہلنے جلنے
کی سکت نہیں ہو گی۔ لیکن جوں ہی انہیں پانی میں چھوڑا جائے، یہ
پھر طاقت پکڑ لیتے ہیں ۔"

"بہت خوب، اسے آپ میری طرف سے چڑیا گھر کے لیے
تحفہ سمجھیے ۔"

"لیکن یہ آپ کو ملا کہاں سے ؟" منتظم نے حیران ہو کر
پوچھا ۔

"سونا جھیل سے ۔" وہ بولے ۔

"جی، کیا مطلب ؟ بھلا سونا جھیل میں مگرمچھ کا کیا کام ؟"
منتظم کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں ۔

اس پر انسپکٹر جمشید نے اسے ساری کہانی سنا دی۔ منتظم کی
حیرت کا کیا پوچھنا ۔ اس کا نام شیر واقدی تھا۔ چڑیا گھر کے منتظم کا
یہ نام بھی خوب تھا اور چڑیا گھر کی مناسبت سے تھا ۔

"ہمارے چڑیا گھر میں اس جیسا کوئی مگرمچھ موجود ہے؟" انسپکٹر
جمشید نے پوچھا ۔

"جی نہیں ۔ اب کل سے چڑیا گھر دیکھنے والوں کی تعداد میں
بے تحاشا اضافہ ہو جائے گا ۔ میں کل کے اخبار میں اشتہار دے
رہا ہوں ۔" شیر واقدی نے خوش ہو کر کہا ۔

"تب تو اسے ہم بھی دیکھنے آئیں گے ۔" فاروق نے کہا اور
شیر واقدی مسکراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے انسپکٹر جمشید کا شکریہ ادا
کیا ۔ گرم جوشی سے مصافحہ کیا ۔ مگرمچھ اپنے آدمیوں کے ذریعے وین
میں رکھوایا اور چلا گیا ۔ اس کے بعد وہ لاش کی طرف متوجہ ہوئے ۔

"میں نہیں سمجھتا، اس کے پوسٹ مارٹم کی کوئی ضرورت ہے،
یا نہیں۔ خیر پھر بھی ضابطے کی کارروائی کرنی ہی پڑے گی ۔" یہ
کہہ کر انہوں نے ہسپتال فون کیا اور لاش کے بارے میں اُنہیں
اطلاع دی ۔ اس کے بعد وہ چاروں آج کے اور کل شام کے اخبارات
لے کر بیٹھ گئے ۔ انہوں نے تمام اخبارات مکمل طور پر دیکھ ڈالے، لیکن
کسی آدمی کی گم شدگی کی خبر نہیں تھی ۔

"حیرت ہے، آخر یہ کون شخص تھا۔ کیا اس کا دنیا میں کوئی نہیں
تھا ؟" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے ۔

"ابا جان، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو گم ہوئے کئی دن ہو
گئے ہوں اور مگرمچھ کا شکار یہ کل بنا ہو ۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا ۔

"ہوں، اس کا بھی امکان ہے، اس کا مطلب ہے ہمیں پچھلے اخبارات بھی دیکھنے پڑیں گے، لیکن نہیں - پہلے میں مختلف تھانوں کو فون کیوں نہ کروں. شاید کسی آدمی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہو"
یہ کہہ کر انہوں نے باری باری تمام تھانوں کو فون کرنا شروع کر دیا لیکن کوئی سراغ نہ لگا — تنگ آکر انھوں نے پُرانے اخبارات کا مطالعہ شروع کیا - اس طرح بھی کچھ نہ بنا تو انسپکٹر جمشید نے لاش کے بارے میں تمام اخبارات میں اشتہار شائع کرانے کا فیصلہ کیا - دوسرے دن کے تمام اخبارات میں ان الفاظ پر مشتمل اشتہار نمایاں جگہ پر شائع کیا گیا

" سونا جھیل سے ایک لاش ملی ہے — جس کا سارا گوشت مچھلیوں نے کھا لیا ہے — لاش کی کلائی پر ایک گھڑی بھی ملی ہے — اگر کسی گھرانے کا کوئی شخص گم ہے تو مہربانی فرما کر وہ آکر لاش اور گھڑی دیکھ لیں "

اشتہار میں مگرمچھ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا — رابطے کے لیے انسپکٹر جمشید نے اپنا نام اور پتا دیا تھا، تاکہ جو کوئی بھی آئے، سیدھا ان کے پاس آئے — یوں بھی گھڑی ان کے پاس تھی — صبح سویرے وہ دفتر پہنچ گئے۔ محمود، فاروق فرزانہ کو چونکہ سکول جانا تھا، اس لیے وہ ان کے ساتھ دفتر نہ جا سکے — ابھی انہیں دفتر پہنچے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت دفتر میں داخل ہوئے :

" السلام علیکم جناب، ہم وہ اشتہار پڑھ کر آئے ہیں "

" وعلیکم السلام ! کیا آپ کا کوئی عزیز گم ہو گیا ہے ؟ "

" جی ہاں، میرا بھائی " مرد نے کہا -

" کیا آپ اس کی گھڑی پہچانتے ہیں، کیونکہ لاش پہچاننا تو بہت مشکل ہے "

" جی ہاں " وہ بولا -

" آپ کے ساتھ آپ کی بیوی ہیں ؟ " انہوں نے پوچھا -

" جی ہاں — میرا بھائی آج سے دس دن پہلے گم ہوا تھا. آپ گھڑی دکھا دیں - میں اسے ایک نظر دیکھ کر ہی یہ جان لوں گا کہ وہ لاش میرے بھائی کی ہے یا نہیں "

" اچھی بات ہے — آپ کے نام کیا ہیں ؟ " انہوں نے پوچھا -

" میرا نام فرخ ایاز ہے - میری بیوی کا نام شانو ایاز "

" انہوں نے ان کے نام نوٹ کیے — پتا بھی لکھا - پتا شہر کی ایک اوسط درجے کے لوگوں کی آبادی کا تھا — اس کے بعد انہوں نے دراز میں سے گھڑی نکال کر دکھائی — جونہی فرخ ایاز کی نظر گھڑی پر پڑی، اس کے منہ سے ایک زور دار چیخ نکلی :

" نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا "

پھر وہ اس طرح لہرایا جیسے بے ہوش ہو کر گرنے والا ہو — انسپکٹر جمشید نے تیزی سے اٹھ کر اُسے سنبھالا اور کرسی میں بٹھا دیا -

" تو یہ گھڑی آپ کے بھائی کی ہی ہے " وہ بولے -

"ہاں، کاش یہ غلط ہوتا۔"

"لیکن آپ اس گھڑی کو کس طرح پہچانتے ہیں؟"

"یہ گھڑی میرے ایک دوست نے لیبیا سے بھیجی تھی ـ ایسی گھڑیاں ہمارے ملک میں تو ملتی ہی نہیں، یہ بہت قیمتی گھڑیاں ہیں ـ حکومت نے ملک میں ان کی درآمد پر پابندی لگا رکھی ہے ـ آپ اس گھڑی کا نام اور نمبر وغیرہ نوٹ کریں اور کسی گھڑی ساز سے فون کرکے معلوم کریں، وہ آپ کو یہی بات بتائے گا۔"

"ہوں، میں ایسا ضرور کروں گا۔" انہوں نے کہا اور پھر اپنے گھڑی ساز کے نمبر گھمانے لگے ـ تھوڑی دیر تک اُس سے فون پر بات کی، پھر ریسیور رکھتے ہوئے بولے:

"گھڑی کے بارے میں آپ کی اطلاع بالکل درست ہے ـ میرے گھڑی ساز نے بھی آپ کی باتوں کی تصدیق کی ہے ـ آیئے، میں آپ کو لاش تک لے چلوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے ـ اکرام کو کچھ ہدایات دیں اور انہیں لے کر ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔

مردہ خانے میں لاش پر نظر ڈالنے کے بعد فرخ ایاز نے کہا:

"لاش دیکھ کر میں کسی نتیجے پر مشکل سے پہنچ سکتا ہوں، کیونکہ لاش اس حالت میں نہیں کہ پہچانی جا سکے؛ تاہم میرے بھائی کا قد اتنا ہی تھا۔"

"ہوں، خیر آپ لاش لے جا سکتے ہیں، کیونکہ آپ کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں پہنچا۔"

"بہت بہت شکریہ جناب، اس کے ساتھ ہی میں ایک گزارش کروں گا ـ یہ کہ وہ گھڑی بھی مجھے دے دی جائے ـ اب یہ گھڑی میرے بھائی کی نشانی کے طور پر میرے پاس رہے گی۔"

"ہاں ضرور، آپ شوق سے گھڑی لے جا سکتے ہیں۔" انہوں نے جیب سے گھڑی نکال کر اس کے حوالے کر دی ـ

"آپ ہمیں ایک چٹ لکھ کر دے دیں ـ ہم ایمبولینس کا بندوبست کرکے یہاں آئیں گے اور لاش لے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا اور چٹ لکھ کر دے دی ـ

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے دفتر پہنچے تو وہاں ایک اور ملاقاتی بیٹھا تھا ـ اکرام نے اس کے بارے میں بتایا:

"ان کا بھی بڑا بھائی گم ہو گیا ہے جناب ـ یہ اشتہار پڑھ کر آئے ہیں۔"

"اوہو، اچھا۔" ان کے منہ سے نکلا، کیونکہ وہ تو سمجھے تھے کہ معاملہ ختم ہوا، پھر سنبھل کر بولے:

"لیکن وہ لاش اور گھڑی تو شناخت ہو چکی ہے اور اس کے وارث دونوں چیزیں لے جا چکے ہیں۔"

"تب تو خدا کا شکر ہے، وہ لاش میرے بھائی کی نہیں تھی۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا ـ

"خدا حافظ جناب، معاف کیجیے، میں نے آپ کو بلا وجہ تکلیف دی۔" وہ مڑتے ہوئے بولا۔

"ایک منٹ جناب، کیا آپ کا بھائی گم ہو گیا ہے؟"

"جی ہاں، اسے گم ہوئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔"

"آپ کا نام؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے فواد زبیری کہتے ہیں۔"

"کیا آپ کے بھائی کی کلائی پر گھڑی بھی بندھی تھی؟"

"جی ہاں۔" اس نے کہا۔

"کوئی اور نشانی، جس سے آپ اسے پہچان سکتے ہیں؟"

"اس کی کلائی پر، عین اس جگہ جہاں وہ گھڑی باندھتا ہے، ایک ہلکے سے زخم کا نشان ہے، زخم کا نشان چاند کی شکل کا ہے۔"

"شکریہ۔ آپ ایک منٹ ٹھہریں۔" انہوں نے کہا اور جلدی جلدی ہسپتال کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ مردہ خانے کے انچارج کو فون پر بلانے میں انہیں زیادہ وقت نہ لگا:

"ہیلو، میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ جس کے بارے میں میں ابھی ابھی لکھ کر دے آیا ہوں کہ فرخ ایاز کے حوالے کر دیا جائے۔ کیا وہ اس لاش کو لے جا چکے ہیں؟"

"جی، ابھی تک نہیں۔ ہم ان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"بہت خوب، آپ ایسا کریں کہ لاش کی کلائی پر جس جگہ

گوشت موجود ہے، بغور جائزہ لیں اور مجھے بتائیں کہ کیا اس جگہ زخم کا کوئی نشان چاند کی شکل کا تو موجود نہیں۔"

"جی بہتر، میں ابھی دیکھتا ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔" اس نے کہا۔ پھر ریسیور رکھنے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کی آواز پھر سنائی دی:

"ہیلو، میں نے کلائی کا معائنہ کیا ہے جناب۔ اس پر چاند کی شکل کے زخم کا نشان موجود ہے۔"

"کیا؟" ان کے منہ سے حیرت زدہ لہجے میں نکلا۔

بھائی کی لاش

چند سیکنڈ تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ انسپکٹر جمشید شدید حیرت کی وجہ سے کچھ نہ بول سکے۔ آخر انہوں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"اچھا تو پھر — فرخ ایاز اور ان کی بیگم کو لاش نہ دی جائے۔ انہیں روک لیا جائے، میں آ رہا ہوں۔ انہیں روکنے کے لیے پولیس کی مدد لینی پڑے تو لے لیں۔ بلکہ پہلے ہی مردہ خانے کے پاس پولیس کے چند کانسٹیبل متعین کر دیں۔ لاش کو جانا نہیں چاہیے۔"

"بہت بہتر — آپ کی ہدایت پر عمل کیا جائے گا۔ لاش ان کے حوالے نہیں کی جائے گی اور انہیں روک بھی لیا جائے گا۔ آپ مطمئن رہیے۔"

"شکریہ، میں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ

دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے، ساتھ ہی فواد زبیری سے بولے:

"آئیے جناب میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف بھاگے۔ فواد زبیری حیرت زدہ سا اٹھا اور ان کے پیچھے باہر نکل گیا۔ اکرام انہیں جاتے ہوئے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکر شروع ہو گیا ہے۔

انسپکٹر جمشید فواد زبیری کو لیے ہسپتال پہنچے۔ مردہ خانے کا انچارج مردہ خانے کے دروازے پر ملا۔ وہاں تین کانسٹیبل بھی موجود تھے۔

"وہ دونوں، ایمبولینس لے کر آئے تو نہیں۔"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ہے، وہ آئیں تو انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ آپ میرے ساتھ آئیے جناب۔" انہوں نے کہا اور فواد زبیری کو لے کر اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے لاش پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ فواد زبیری لاش پر جھک گیا اور کافی دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ آخر اس نے کلائی پر غور سے دیکھا اور بولا:

"زخم کا یہ نشان کہتا ہے کہ یہ لاش میرے بھائی کی ہے، لیکن باقی تمام جسم ناقابل شناخت ہو کر رہ گیا ہے۔"

"قد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے بھائی کا قد بالکل اتنا ہی تھا۔"

"تب یہ آپ کے بھائی کی ہی لاش ہے۔"

"نہیں۔" اس نے غیر یقینی کے عالم میں کہا۔

"زخم کی موجودگی میں آپ کو یہ بات تسلیم کرنا ہی پڑے گی۔ کیا آپ اپنے بھائی کی گھڑی پہچانتے ہیں۔"

"جی ہاں، اس کے پاس ایک بہت معمولی گھڑی تھی۔ بہت سستی سی۔"

"جی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کی کلائی پر سے تو ہمیں بہت قیمتی گھڑی ملی تھی۔" انہوں نے کہا۔

"میں نہیں سمجھ سکتا۔ قیمتی گھڑی اسے کہاں سے مل گئی تھی؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ کا بھائی پندرہ دن پہلے گم ہوا تھا؟" انہوں نے تصدیق طلب لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"وہ کہاں کام کرتا تھا، کیسے گم ہوا، ذرا مجھے تفصیل سے بتائیں۔ کیا آپ کے پاس اس کی کوئی تصویر ہوگی۔"

"وہ ہوٹل المارا میں ملازم تھا۔ وہاں بینڈ ماسٹر تھا۔ دن رات وہیں رہتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آ جاتا تھا اور وہ دن اس کی چھٹی کا دن ہوتا تھا۔ پچھلے ہفتے چھٹی کے دن جب وہ میرے پاس نہ پہنچا تو میں نے ہوٹل فون کیا۔ وہاں سے بتایا گیا

کہ وہ چھٹی کے روز صبح سویرے ہی ہوٹل سے رخصت ہو گیا تھا۔ میں بہت حیران ہوا کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ میں خود ہوٹل گیا، مینیجر سے ملا۔ کاؤنٹر کلرک سے بات کی، لیکن سب نے یہی کہا کہ چھٹی کے روز صبح سویرے ہی وہ چلا گیا تھا۔ آخر میں نے تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی اور خود بھی عزیزوں اور رشتے داروں کے ہاں اسے ڈھونڈتا پھرا، لیکن آج پندرہ دن گزرنے پر بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ آج آپ کی طرف سے شائع ہونے والا اشتہار پڑھا۔ تو آپ کے پاس پہنچ گیا۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کے دیے ٹمٹمانے لگے تھے۔

پھر اس نے جیب سے ایک تصویر بھی نکال کر انہیں دی۔ یہ ایک خوب صورت آدمی کی تصویر تھی۔

پھر بہت دیر گزر گئی، لیکن فرخ ایاز اور شانو ایاز ایمبولینس لے کر نہ آئے۔ آخر انسپکٹر جمشید ان کے بتائے ہوئے پتے کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک بوڑھے آدمی کا چہرہ نظر آیا۔

"مجھے فرخ ایاز سے ملنا ہے۔"

"فرخ ایاز، لیکن اس نام کا تو یہاں کوئی آدمی نہیں رہتا۔"

"یہ آپ کا گھر ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں، کیا آپ کو شک ہے؟" بوڑھے نے حیران ہو کر کہا۔

"جی نہیں، کسی نے مجھے یہی پتا بتایا تھا۔ اُس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔"

"آپ کو اس سے قرض لینا ہوگا شاید — یہ مقروض لوگ اسی طرح دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ میں خود اس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں لٹ بیٹھا ہوں۔"

"خدا آپ کے حال پر رحم فرمائے" — انھوں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئے —

ان کی حیرت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا —

⊙

ہوٹل المارا کا نام انسپکٹر جمشید نے بہت دفعہ سنا تھا۔ یہ شہر کے آخری کنارے واقع تھا — ان کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ہوٹل المارا اگرچہ بہت بڑا ہوٹل ہے، لیکن اس میں اچھے لوگ نہیں بیٹھتے۔ وہ اوباش لوگوں کا ہوٹل ہے — فواد زبیری کے منہ سے ہوٹل المارا کا نام سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے تھے — دوسری طرف وہ فرخ ایاز اور شانو ایاز کے بارے میں سوچ رہے تھے — ان کے ایمبولینس لے کر واپس نہ آنے کا مطلب صرف اور صرف یہ تھا کہ وہ لوگ صرف اس گھڑی کے لیے آئے تھے — گھڑی حاصل ہوتے ہی ان کا مقصد پورا ہوگیا، لہذا وہ لاش

کے لیے کیوں آتے — تو کیا اس گھڑی کی کوئی اہمیت تھی۔ ادھر فواد زبیری کا کہنا تھا کہ اس کا بھائی اپنی کلائی پر ایک معمولی سی قیمت کی گھڑی باندھتا تھا — اتنا تو انہیں یقین آچکا تھا کہ سونا جھیل میں مرنے والا فواد زبیری کا بھائی ہی تھا — اس نے اپنے بھائی کا نام جواد زبیری بتایا تھا —

شام کی چائے کی میز پر انھوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو سارے حالات سنائے — فرخ ایاز اور شانو ایاز کے حلیے بھی بتائے اور یہ بھی کہ وہ گھڑی گنوا بیٹھے ہیں — اس کے بعد انھوں نے ان کے چہروں میں معمولی سی تبدیلیاں کیں اور پھر ایک سوٹ کیس لے کر گھر سے نکلے — جیپ میں ہوٹل تک پہنچنا مناسب نہیں تھا؛ چنانچہ ایک ٹیکسی لی اور ہوٹل المارا سے چند گز ادھر ہی اُتر گئے — پیدل چلتے ہوئے وہ ہوٹل المارا کے دروازے پر پہنچے — کاؤنٹر کے پاس رُک کر انسپکٹر جمشید نے اپنے دونوں ہاتھ اس پر ٹکا دیے — کاؤنٹر کلرک کی نگاہیں بے اختیار ان کے ہاتھوں پر جم گئیں — ان کی انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں — ان کی کلائی میں ایک بہت قیمتی غیر ملکی گھڑی چمک رہی تھی — محمود اور فاروق کی ٹائی پنوں میں ننھے ننھے ہیرے اپنی شعاعیں ادھر ادھر منتشر کر رہے تھے۔ فرزانہ کے بالوں میں خالص سونے کا کلپ لگا تھا — کلرک نے ایک ہی نظر میں سب کچھ بھانپ لیا اور نہایت ادب سے بولا:

"فرمائیے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں دو کمروں کی ضرورت ہے۔ ہم اس شہر میں ہیروں کی تجارت کے لیے آئے ہیں، ایک ہفتے کا قیام ہو گا۔"

"بہت بہتر، ہم آپ کی خدمت میں نہایت آرام دہ کمرے پیش کریں گے۔"

اس نے ان سے ایک ہفتے کا پیشگی کرایہ لیا۔ دو کمروں کی چابیاں انہیں دیں اور ایک بیرے کو ان کا سامان اٹھانے کا اشارہ کیا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ سامان اپنے کمرے میں رکھنے اور تالے لگانے کے بعد نیچے ہال میں بیٹھے تھے اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ چند لوگ انہیں مسلسل گھور رہے ہیں۔ اسی وقت ایک بیرا ان کی میز پر آیا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں جناب؟" اس نے ادب سے کہا۔

"محمود، کھانے پینے کی چیزوں کا انتخاب تم کرو۔"

"جی بہتر۔" محمود نے کہا اور مینو پر نظر دوڑانے لگا۔ انسپکٹر جمشید بینڈ بجانے والوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سرسری لہجے میں بولے:

"بینڈ کی دھن کچھ غیر مانوس سی ہے۔ پچھلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو دھن بہت ہی پیاری تھی۔"

"جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے۔ دراصل ہمارا ماہر ترین بینڈ ماسٹر گم ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا کہا، گم ہو گیا ہے؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

"جی ہاں، آج سے تقریباً پندرہ دن پہلے وہ اپنی چھٹی کا دن گزارنے یہاں سے گیا تھا، پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ خدا جانے کہاں چلا گیا۔ ہوٹل کے عملے کا خیال ہے کہ اسے کوئی زیادہ اچھی ملازمت مل گئی ہے۔"

"لیکن اس صورت میں انہیں اطلاع تو دینی چاہیے تھی۔"

"اس نے ایسا نہیں کیا۔ خیر، آپ فکر نہ کریں، ہم ایک اچھے بینڈ ماسٹر کی تلاش میں ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ نے کیا کہا، وہ ہفتہ وار چھٹی منانے گیا تھا، تو کیا وہ دن رات ہوٹل میں ہی رہتا تھا؟"

"جی ہاں، ہوٹل کے اکثر ملازم ہوٹل میں ہی رہتے ہیں۔"

"کیا ملازمین کے لیے الگ [illegible] بنائے گئے ہیں۔"

"جی ہاں، یہی بات ہے۔" اس نے اکتا کر کہا۔ شاید وہ ان کے سوالات سے تنگ آ گیا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے، آپ میرے سوالات سے تنگ آ گئے ہیں۔ دراصل مجھے موسیقی سے بہت لگاؤ ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں جناب، آپ شوق سے سوالات کیجیے۔" بیرے نے زبردستی کی خوش اخلاق مسکراہٹ اپنے چہرے پر چپکاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، اس کا کوارٹر خالی پڑا ہو گا؟"

"جی ہاں، جب تک اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو جاتا، اس وقت تک وہ کس طرح کسی کو دیا جا سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک بہت ہی ماہر بینڈ ماسٹر کو جانتا ہوں۔ لیکن وہ جہاں بھی کام کرتا ہے، پہلے رہائش کے بندوبست کی بات کرتا ہے۔ اسی خیال سے میں نے اتنے سوالات کیے ہیں۔ اگر میں اسے یہاں بلا لوں تو کیا ہوٹل کی انتظامیہ اسے ملازمت دے دے گی؟"

"جی ہاں، کیوں نہیں۔ اس کا ٹسٹ لینے کے بعد۔" اس نے کہا۔

"اس سلسلے میں مجھے کس سے بات کرنی چاہیے؟"

"ہوٹل کے مینیجر ڈی کومب سے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" وہ بولے اور بیرا تیزی سے ایک طرف مڑ گیا۔

"آخر آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"میں جواد زبیری کے کوارٹر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی مینیجر سے بھی ملاقات کروں گا۔ ابھی تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا، یہ بات بھی اپنی جگہ کم حیرت انگیز نہیں کہ سونا جھیل میں مگر مچھ کہاں سے آ گیا۔ پھر یہ کہ جواد زبیری کے نقلی بھائی کو گھڑی

کی ایسی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ صرف گھڑی حاصل کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ جواد زبیری پندرہ دن پہلے کا گم شدہ ہے، وہ تو چھٹی کا دن گزارنے اپنے بھائی فواد زبیری کے گھر آ رہا تھا، پھر وہ سونا جھیل تک کس طرح پہنچ گیا۔ ارے....." وہ کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں الجھن صاف نظر آنے لگی۔

"کیا بات ہے ابا جان، خیر تو ہے؟"

"ایک حیرت انگیز بات۔ جس کا خیال مجھے ابھی ابھی آیا ہے۔ سنو، جواد زبیری پندرہ دن پہلے غائب ہوا تھا، لیکن جھیل میں وہ کل حادثے کا شکار ہوا ہے۔ کم از کم اس کی گھڑی یہی بتاتی ہے، تو پھر۔ وہ چودہ دن تک کہاں غائب رہا؟"

"اوہ ہاں، واقعی اس بات کی طرف تو ہمارا دھیان ہی نہیں گیا۔" محمود بولا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پندرہ دن پہلے ہی جھیل میں گرا ہو اور اس کی گھڑی چودہ دن تک چلتے رہنے کے بعد کل بند ہوئی ہو۔"

"ہاں، اس کا بھی امکان ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے: "لیکن اگر گھڑی چودہ دن تک چلتی رہی تو پھر اب کیوں بند ہو گئی؟"

"مگر مچھ نے کوئی ٹکر دے ماری ہو گی۔" فاروق بولا۔

"یار کبھی تو کوئی کام کی بات بھی کر لیا کرو۔" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

"فاروق کی بات بھی ناممکن نہیں — ہو سکتا ہے، گھڑی پودہ دن تک پانی میں چلتی رہی ہو اور کل مگرمچھ کی ٹکر لگنے سے رُک گئی ہو — مگرمچھ لاش سے گوشت تو نوچتا ہی رہا ہے۔"

"یہاں تو ہو سکتا ہے کے ڈھیر لگ گئے — خدا جانے ان میں سے کون سا ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔" فاروق نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"میں نے آج رات ہی جواد زبیری کے کوارٹر کی تلاشی کا پروگرام بنایا ہے اور تم تینوں میرے ساتھ ہو گے۔"

"ارے باپ رے — اتنا خطرناک کام۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"لیکن ابا جان، ہمیں یہ کس طرح پتا چلے گا کہ جواد زبیری کا کوارٹر کونسا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے — گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے — لازمی بات ہے کہ تھانے دار نے اس کے کوارٹر کی تلاشی لی ہو گی۔ بس میں اسے فون کروں گا اور کوارٹر کا نمبر معلوم کر لوں گا اور یہ بھی کہ تلاشی لینے پر اسے کوئی کام کی چیز ملی تھی یا نہیں۔"

"کمال ہے یہ سیدھی سی بات ہمیں نہیں سوجھی۔" فرزانہ نے کہا۔

"اس لیے کہ تم بچی ہو۔" فاروق مسکرایا۔

"اور تم، اپنی بھی تو کہو۔" فرزانہ جل بھن کر بولی۔

"میں تم سے بڑا بچہ ہوں۔" فاروق بھلا کب چپ رہنے والا تھا۔

عین اسی وقت ہوٹل کے ہال میں ایک بہت لمبے قد کا خوف ناک سا آدمی داخل ہوا — اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایک پُراسرار سی خاموشی پورے ہال پر چھا گئی — سب لوگ سہمے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"یہ کوئی جن تو اندر نہیں گھس آیا — سب لوگ سہمے سہمے نظر آ رہے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہاں، شاید یہ یہاں کی جانی پہچانی شخصیت ہے۔" انسپکٹر جمشید اسے دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"یا خدا رحم، یہ تو ہماری طرف ہی آ رہا ہے۔" فاروق نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو تمہاری کیوں جان نکلی جا رہی ہے۔" محمود بولا۔

اتنے میں لمبے قد والا ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا — اس میز پر پہلے سے دو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دور جا کر ایک خالی میز پر بیٹھ گئے — لمبے آدمی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا — اس کے بیٹھتے ہی بیرا تیزی سے اُس کی

طرف لپکا۔

"کیا حکم ہے مسٹر ہاورڈ؟"

"ڈی کومب کو بلاؤ۔"

"بہت بہتر جناب۔" بیرے نے کہا اور ایک سمت میں تیز تیز قدم اٹھانے لگا، پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد بیرا ایک چھوٹے سے قد والے گول مٹول آدمی کے پیچھے چلتا نظر آیا۔ تیزی سے چلتا ہوا گول مٹول آدمی بالکل کسی فٹ بال کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہ فٹ بال لمبے مسٹر ہاورڈ کی میز کے قریب آ کر رکا اور جھک کر اسے سلام کرنے کے بعد بولا:

"میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟"

"ہوٹل کا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"ایک دم فسٹ کلاس۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تمام حسابات لے کر میرے کمرے میں آ جاؤ۔ وہیں بات کریں گے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور اس کی نظریں انسپکٹر جمشید کے چہرے سے ٹکرا گئیں۔

چند لمحے تک وہ ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتا رہا، پھر ایک ایک قدم اُن کی طرف اٹھانے لگا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ انہیں حیرت تھی کہ ہاورڈ کو ان کے والد

کے ایک اپ زدہ چہرے میں کیا چیز نظر آ گئی ہے کہ وہ ان کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے۔

ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔

ہاورڈ

اُن کے نزدیک آکر وہ رک گیا — چند لمحے تک انہیں بغور دیکھتا رہا، پھر پھنکارنے کے انداز میں بولا:

"کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"کیا ہوٹل میں آنے والے ہر گاہک سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر پُرسکون آواز میں کہا۔

"نہیں، لیکن مجھے تمہارا چہرہ جانا پہچانا سا کیوں لگ رہا ہے؟" ہاورڈ نے کہا۔

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں، یہ اپنے دماغ سے پوچھو۔" انہوں نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

"تم میری باتوں کے جوابات سیدھی طرح نہیں دے رہے۔ شاید تم نہیں جانتے، میں کون ہوں — میرا نام ہاورڈ ہے اور میں اس ہوٹل کا مالک ہوں۔"

"بس یا کچھ اور بھی؟" انسپکٹر جمشید مذاق اڑانے والے لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"میرا مطلب ہے، اس نام اور ہوٹل کا مالک ہونے کا مجھ پر کوئی رعب نہیں پڑا — کوئی اور بات کرو۔"

"بہت خوب، تم سے تو دو دو باتیں کرنا ہی ہوں گی۔" اُس نے ہنس کر کہا اور مڑتے ہوئے بولا:

"مسٹر ڈی کومب، حساب کتاب کی کتابوں کے ساتھ میں اس شخص کو بھی اپنے کمرے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر جناب۔"

ہاورڈ تیز تیز چلتا لفٹ کی طرف چلا گیا — ہال میں موجود تمام لوگوں نے اسے لفٹ میں داخل ہوتے دیکھا — پھر سب کی نظریں اُن کی میز کی طرف اُٹھ گئیں — اب ان کی میز کے چاروں طرف تقریباً آٹھ بیرے پستول تانے کھڑے تھے — انہوں نے ان بیروں کی طرف دیکھا تو ان کے تیور خطرناک نظر آئے —

"چلیے جناب، آپ کو میرے ساتھ اوپر چلنا ہے۔" ڈی کومب نے سرد آواز میں کہا —

"چلو۔" انہوں نے لاپرواہی سے کہا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی محمود، فاروق اور فرزانہ بھی اُٹھے —

"تم تینوں ان کے ساتھ نہیں جاؤ گے۔" ڈی کومب نے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہماری موجودگی میں تمہارے مسٹر ہاورڈ ڈر جائیں گے؟"

"ان کا حکم یہی ہے کہ ان صاحب کو ان کے کمرے میں پہنچا دیا
جائے۔" ڈی کومب نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور پھر انسپکٹر جمشید سے
بولا:

"چلیے جناب، آپ کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ کوئی غلط حرکت نہ
کریں؛ ورنہ نتیجے کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔"

"اچھا۔" انسپکٹر جمشید بولے اور اُٹھ کر لفٹ کی طرف چل دیے۔
آٹھوں پستول بردار انہیں اپنے حلقے میں لیے آگے بڑھ رہے تھے۔
ڈی کومب ان سب سے آگے تھا۔ ہال میں موجود تمام لوگ
حیرت اور خوف کے عالم میں اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ بے چارہ تو گیا کام سے۔" ان کے نزدیک والی میز
پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" محمود کے منہ سے نکلا۔

"یہ تمہارے والد تھے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں، لیکن ہم آپ کے جملے کا مطلب نہیں سمجھے۔"

"ہاورڈ اس ہوٹل کا مالک ہے اور اس شہر کی پولیس اس
سے بہت ڈرتی ہے۔ دو چار پولیس والوں نے اس کے خلاف کچھ
قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی، لیکن پھر غائب ہوگئے۔ ان کا
آج تک پتا نہ چل سکا کہ وہ کہاں گئے۔ پولیس نے ان کی تلاش میں
چپا چپا چھان مارا، اس ہوٹل کی کئی بار تلاشی لی گئی، لیکن ان کا کوئی

سراغ نہ ملا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ہاورڈ سے بہت ڈرتے ہیں۔ پولیس
والے بھی اس کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے ڈرتے ہیں۔ بڑے
بڑے پولیس آفیسروں کو ہاورڈ بہت قیمتی تحفے بھیجتا ہے۔ وہ اس سے
بہت خوش ہیں اور اس کے کسی معاملے کی چھان بین کرانا پسند
نہیں کرتے۔"

"سوال یہ ہے کہ یہ شخص ہاورڈ ایسا کیوں کرتا ہے۔ کیا یہ
کوئی غیر قانونی کام بھی کرتا ہے، کیونکہ ہوٹل کا کاروبار تو غیر قانونی
نہیں ہے۔" فرزانہ نے سوال کیا۔

"کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہاورڈ اس شہر کا ہی نہیں، پورے
ملک میں سمگلنگ کا بادشاہ ہے۔"

"کیا کہا؟ سمگلنگ کا بادشاہ؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

اس کی حیرت بھی بجا تھی۔ ان دنوں ملک میں سمگلنگ کا
بہت زور تھا۔ سمگلر دوسرے ملکوں سے نشہ آور ادویات، ہیروئن
وغیرہ بہت بھاری مقدار میں لا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ہیروں کی
سمگلنگ بھی زوروں پر تھی۔

"ہاں، سمگلنگ کا بادشاہ۔" اس نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پولیس اسے پکڑ کیوں نہیں لیتی؟"

"ثبوت کے بغیر ہاورڈ پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔" اس آدمی
نے کہا۔

"محمود، میرا خیال ہے ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں ہاورڈ
کے کمرے تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" فرزانہ نے بے چین ہو
کر کہا۔

"اوہ ہاں، ٹھیک ہے۔ آؤ۔"

"تم لوگ اوپر جانے کا ارادہ رکھتے ہو، یعنی موت کے منہ میں؟"
اس ادھیڑ عمر آدمی نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"تو کیا ہم اپنے والد کی مدد نہ کریں؟"

"تم ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ اپنی بھی جانیں کھو بیٹھو گے۔"

"پروا نہیں، کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ ہاورڈ کا کمرہ کون
سی منزل پر ہے۔"

"ہاں، آخری منزل پر آخری کمرہ۔" اس نے کھوئے کھوئے
لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ کو یہ سب باتیں کس طرح معلوم ہوئیں؟"

"میرا بھی کسی زمانے میں ہاورڈ سے واسطہ رہ چکا ہے۔ یہ ایک
لمبی کہانی ہے اور تمہارے پاس شاید وقت نہیں ہے؛ لہذا جاؤ،
اپنے والد کے لیے جو کرنا چاہتے ہو کر لو۔ آج کا دن تم چاروں
کی بدبختی کا دن ہے۔ کاش تم اوپر جانے کی بجائے باہر کا رُخ
کرتے۔" اس کی آواز میں درد پیدا ہو گیا۔ انہوں نے دیکھا، ادھیڑ عمر
آدمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ اپنی میز پر تنہا تھا۔

انہوں نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

⊙

لفٹ میں بھی آٹھوں پستول ان کی طرف تنے رہے۔ آخر لفٹ
آخری منزل پر رک گئی۔

"چلیے جناب۔" ڈی کومب نے کہا۔

"لیکن آپ حساب کتاب کی کتابیں ساتھ نہیں لائے۔" انسپکٹر
جمشید ڈی کومب کے خالی ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
اس نے انہیں حیرت بھری نظروں سے گھور کر دیکھا اور پھر بولا:

"آپ اپنی فکر کریں جناب۔"

"ارے بھئی، اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ ایک دن تو مرنا
ہی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

وہ اُن کے آگے چلتے ہوئے برآمدے کے آخری سرے تک
پہنچ گئے۔ اب ڈی کومب نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔
اندر سے فوراً ہی ہاورڈ کی آواز سنائی دی:

"اندر چلے آؤ۔"

ڈی کومب نے انہیں سب سے پہلے اندر داخل ہونے کا اشارہ
کیا۔ انہوں نے دروازے پر دباؤ دیا اور اندر داخل ہو گئے۔ ہاورڈ

ایک آرام کرسی میں لیٹا نظر آیا — اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں
ایک موٹا سا سگار دبا ہوا تھا اور اس میں سے دھواں لہریں لیتا اوپر
اُٹھ رہا تھا۔ دھوئیں کی بُو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

"خوش آمدید، آپ کا نام کیا ہے مسٹر؟" ہاورڈ نے خوش
اخلاق لہجے میں کہا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا — وہ لاپروائی کا
مظاہرہ کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے — پستول بردار بیرے ان کے
دائیں بائیں اور پیچھے کھڑے ہو گئے۔

"مجھے جمشید کہتے ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"خوب، کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ مجھے آپ کا چہرہ جانا
پہچانا سا کیوں لگ رہا ہے۔"

"بھلا یہ بات میں کس طرح بتا سکتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن۔" اس نے زور دار انداز میں لیکن کہا اور پھر کئی
سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد بولا: "یہ بات تو آپ کو ہی بتانا
ہو گی۔"

"مجھے افسوس ہے، میں نہیں بتا سکتا۔"

"ڈی کومب، ہیری کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہوگا جناب۔" ڈی کومب نے کانپ کر کہا۔

"اس سے کہو، اس کی یہاں ضرورت ہے۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور فون پر ایک نمبر گھما کر بولا:

"ہیلو، ہیری! باس کے کمرے میں تمہاری ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر اس
نے ریسیور رکھ دیا۔

کمرے میں چند لمحے تک گہری خاموشی طاری رہی، پھر ایک ہاتھی
جیسے ڈیل ڈول والا آدمی اندر داخل ہوا۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا باس۔"

"ہاں، مجھے اس شخص سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کا چہرہ
مجھے جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے؟" اُس نے کہا۔

"بہت خوب، ابھی معلوم کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ان
کی طرف مُڑا — ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ خوف زدہ انداز
میں پیچھے ہٹا — اسے اس طرح پیچھے ہٹتے دیکھ کر ہاورڈ کی حیرت
کی کوئی انتہا نہ رہی — ڈی کومب اور بیرے بھی پریشان ہو گئے۔

"کیا ہوا ہیری؟ اس آدمی کو دیکھ کر تمہیں سانپ کیوں سونگھ
گیا ہے۔"

"باس، آپ کو جواد زبیری کا چہرہ یاد ہے۔"

"ہاں کیوں؟" ہاورڈ نے چونک کر کہا۔

"تو پھر اس کا چہرہ آپ کو اس سے ملتا جلتا نظر کیوں نہیں
آ رہا۔"

"اوہ، تم ٹھیک کہتے ہو — یہ شخص تو جواد زبیری سے بہت ملتا
ہے۔ کیوں مسٹر، کیا تم اس کے بھائی ہو۔"

"ٹھیک سمجھے، میں دراصل اسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ پندرہ دن ہو گئے اسے گم ہوئے۔ آخر وہ کہاں چلا گیا ہے؟" انہوں نے کہا، دراصل اپنے چہرے پر میک اپ کرنے سے پہلے انہوں نے جواد زبیری کی تصویر اپنے سامنے رکھ لی تھی اور اس کی مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"دھت تیرے کی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں تو سمجھا تھا، کوئی اور ہی بات ہے، جس کی وجہ سے اس شخص کا چہرہ جانا پہچانا سا لگا تھا۔ خیر تو مسٹر، تمہارا بھائی پندرہ دن پہلے یہاں سے گیا تھا۔ اب تک واپس نہیں آیا۔ ہم تو خود اس کا انتظار کر کے تھک چکے ہیں اور ایک نیا بلینڈ ماسٹر رکھنے کی فکر میں ہیں۔ اچھا اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں تمہیں غلط سمجھا تھا۔"

"بہت بہتر، چلا جاتا ہوں۔ مجھے یہاں ٹھہرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" انہوں نے کہا اور کمرے سے نکل آئے۔

اسی وقت انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو لفٹ سے اترتے دیکھا۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرائے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید نے فرزانہ کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے دیکھے۔ وہ بلا کی پھرتی سے مڑے۔ اگر انہیں ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو ہیری کا مکا ان کے سر پر پڑا ہوتا۔ لیکن ان کے گھومنے کی وجہ سے مکا لہرا کر رہ گیا۔

"کیا ارادے ہیں دوست، تمہارے باس نے تو مجھے جانے کی اجازت دے دی تھی۔"

"باس کی اجازت کو صرف ہم ہی سمجھ سکتے ہیں۔" اس نے غرا کر کہا۔

"تو کیا اس نے مجھے ختم کر دینے کا حکم دیا ہے؟"

"نہیں، تمہیں صرف بے ہوش کرنے کا پروگرام ہے۔ اس کے بعد تمہیں تمہارے بھائی کے پاس پہنچانے کا ارادہ ہے۔"

"تو تم جانتے ہو، وہ کہاں ہے؟" وہ بولے۔

"ہاں، میں جانتا ہوں۔ تم بھی اس جگہ کو دیکھ کر خوش ہو گے۔" ہیری ہنسا۔

"تب پھر مجھے بے ہوش کر کے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوش میں رہ کر بھی تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں ہر کام باس کی مرضی کے عین مطابق کرنے کا عادی ہوں۔ اس نے یہی ہدایت دی ہے کہ تمہیں بے ہوش کر کے لے جایا جائے۔"

"اچھا جیسے تمہاری اور تمہارے باس کی مرضی۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔

ہیری دونوں ہاتھ آگے بڑھائے ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ اس کے ڈیل ڈول نے انہیں چوکنا ہونے پر مجبور کر دیا۔

انہوں نے محسوس کیا کہ اگر اس کے دونوں ہاتھوں میں ان کی گردن آ گئی تو یہ بلاشبہ نہایت آسانی سے ان کا گلا گھونٹ دے گا؛ چنانچہ وہ جھکائی دے کر اس کی کمر کی طرف آ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مُڑتا، انہوں نے دائیں پیر کو پوری قوت سے اس کی کمر پر رسید کر دیا۔ یہ دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی، کہ وہ ان کی ٹھوکر سے صرف چند قدم تک لڑکھڑایا تھا اور پھر سنبھل گیا تھا، جب کہ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے وار سے اوندھے منہ گر پڑے گا۔ وہ پلٹا تو اس کے چہرے پر ایک خوف ناک مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ اتنے میں محمود، فاروق اور فرزانہ قریب آ گئے۔

"ہم مدد کریں ابا جان۔"

"نہیں، تم اس آخری کمرے کا دھیان رکھو۔ اس طرف سے نہ کوئی وار کیا جائے۔"

"بہت بہتر ابا جان۔" محمود نے کہا اور تینوں اس کمرے کے دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اس طرح وہ اپنے والد اور اس خوف ناک ڈیل ڈول والے آدمی کی لڑائی بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لڑائی دیکھنے سے ان کے حکم کی تعمیل بہت ضروری تھی۔

ادھر ہیری نے جھلا کر ایک دوہتڑ ان کے سر پر مارا۔ انسپکٹر جمشید پھرتی سے نیچے بیٹھ گئے۔ اور وہ اپنی جھونک میں آگے کو جھکا۔ اسی وقت انہوں نے اس کی کمر پر ایک لات پہلے کی نسبت

زیادہ قوت سے رسید کر دی۔ وہ پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، سنبھل نہ سکا۔ منہ کے بل فرش پر آ رہا۔ بس پھر کیا تھا، انسپکٹر جمشید اُسے چاپ بیٹھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں کو ملا کر ایک چپڑاس اس کی کنپٹی پر دی اور جب یہ دیکھا کہ اس پر اس چپڑاس کا کوئی اثر نہیں ہوا تو تابڑ توڑ مارتے چلے گئے۔ ہیری ایک بار بھینسے کی طرح ڈکرایا اور پھر بے سدھ ہو گیا۔

"آؤ بھئی چلیں۔ اس کمرے کا دروازہ تو نہیں کھلا تھا؟"

"جی نہیں۔" محمود نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ان کا خیال ہو گا کہ ہیری مجھے بے بس کر کے جواد زبیری تک پہنچا دے گا، اس لیے دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھی ہو گی۔ آؤ چلیں۔"

"لیکن ابا جان، کم از کم انہیں اطلاع تو دے دینی چاہیے کہ آ کر اپنے ہاتھی کو اٹھا لیں۔" فاروق نے کہا۔

"یہ تو وہی بات ہو گی، آ بیل مجھے مار۔" فرزانہ بولی۔

"معاف کرنا اس کمرے میں بیل نہیں، ہوٹل کا مالک اپنے مینجر اور بیروں کے ساتھ موجود ہے۔" فاروق نے کہا۔

"بیروں کے بھیس میں غنڈے کہو۔" محمود بولا۔

"چلو یہی سہی۔ آخر ہمیں کیا ضرورت ہے، انہیں چھیڑنے کی۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور ڈی کومب کا چہرہ نظر آیا:

"باس تمہیں واپس کمرے میں بلا رہا ہے۔ اسے تمہارا یہ انداز بہت پسند آیا ہے۔"

حملہ ہوتا ہے

وہ واپس مڑے اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس مرتبہ محمود فاروق اور فرزانہ ساتھ تھے۔ کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے دیکھا، ہاورڈ کے چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"بھئی بہت خوب، تمہارا لڑنے کا انداز بہت ہی پیارا ہے۔ ہیری کو شکست دینا اتنا آسان کام نہیں۔ لیکن تم نے اسے صرف چند منٹ میں ڈھیر کر دیا۔ کیا تم واقعی جواد زبیری کے بھائی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔ میں اسی کی تلاش میں نکلا ہوں۔"

"اور وہ بھی بچوں کو ساتھ لے کر؟"

"یہ بھی اپنے چچا کے لیے بہت پریشان ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا تم بھی بینڈ بجانا جانتے ہو؟"

"جواد کو بینڈ میں نے ہی سکھایا تھا۔"

"تو پھر میں تمہیں اپنے ہوٹل میں بینڈ ماسٹر کی ملازمت دینے کے لیے تیار ہوں۔" ہاورڈ نے کہا۔

"شکریہ، ابھی تو میرے سامنے اپنے بھائی کی تلاش کا مسئلہ ہے۔ ملازمت کے بارے میں بعد میں غور کروں گا۔" انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ تمہارے بھائی کو بھی ملازم رکھنے پر تیار ہوں۔"

اس کے بعد وہ مڑے اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہال میں موجود لوگوں نے انہیں صحیح سلامت واپس آتے دیکھا تو بہت حیران ہوئے اور انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

"ابھی تک ہم یہ پتا نہیں چلا سکے کہ جواد زبیری سونا جھیل تک کس طرح پہنچ گیا تھا۔ جھیل میں مگرمچھ کہاں سے آ گیا۔ اس گھڑی کا راز کیا ہے۔ فرخ ایاز اور شانو ایاز کون تھے۔ وہ کیوں اڑائے گئے۔ اس گھڑی سے ہم کیا راز معلوم کر سکتے تھے۔" انسپکٹر جمشید دبی آواز میں کہتے چلے گئے۔

"اور میری سمجھ میں یہ شخص ہاورڈ نہیں آیا۔ یہاں سے آپ کو اس طرح جانے دیا۔ جیسے اس پورے ہال پر اس کی حکمرانی ہو اور

پھر اپنے بدمعاش کے پٹ جانے پر آپ سے خوش ہو گیا۔" فرزانہ بولی۔

"میں اس کے بارے میں بھی غور کر رہا ہوں۔" وہ بولے۔

اسی وقت محمود کو ادھیڑ عمر آدمی کا خیال آیا اور اس کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے یہ باتیں اپنے والد کو بتا دیں۔

"وہ کہاں بیٹھا تھا؟" انہوں نے پوچھا۔

"ساتھ والی میز پر۔ شاید وہ جا چکا ہے۔"

"تمہیں اس کا نام اور پتا ضرور معلوم کرنا چاہیے تھا۔" وہ بولے۔

"یہ ہم سے غلطی ہو گئی۔" فاروق نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں، سمگلنگ کے سلسلے میں میں نے بھی ہاورڈ کا نام سنا ہے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ اس کا اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ آج تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے پولیس والوں سے بھی بہت زبردست تعلقات ہیں۔ اوہو.... یہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔" کہتے کہتے وہ چونک اٹھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں حیران ہو کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر الجھن کے آثار صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

"کیا بات ہے، ابا جان؟" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہماری نگرانی شروع کرادی گئی ہے — میری چھٹی حس کہہ رہی ہے
کہ نگرانی کرنے والوں کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ اس کا مطلب
:ہاورڈ کو میری بات پر یقین نہیں آیا — ہمیں فوراً اپنے کمروں کا
خ کر چاہیے ؛ ورنہ جلد ہی کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"
یہ الفاظ انھوں نے سرگوشی میں ادا کیے تھے۔ محمود، فاروق اور
فرزانہ نے سرسری انداز میں پورے ہال پر نظریں دوڑائیں، مگر انہیں
کہیں نگرانی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔

"ہمیں تو کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا۔ جس پر نگرانی کا شبہ کیا
جا سکے۔" فرزانہ نے کہا۔

"اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارا اپنے کمروں تک جانا
بھی بہت مشکل ثابت ہوگا — وہ لوگ ہمیں ہال میں ہی ختم کرنے
کا پروگرام بنا چکے ہیں — کسی طرف سے خفیہ فائرنگ ہوگی اور ہم
ڈھیر ہو جائیں گے۔ سنو، جونہی میں نیچے گروں، تم تینوں بھی نیچے
گر جانا۔ فائر بے آواز ہوں گے — ہم چاروں طرف سے ان کے
نشانے کی زد میں ہیں اور اپنے بچاؤ کے لیے اس کے سوا کچھ بھی
نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے دیکھا، ان کے والد خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ زندگی
میں انھوں نے انہیں کبھی خوف زدہ نہیں دیکھا تھا۔ انہیں بہت
حیرت ہوئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔

"ابا جان، آپ اور خوف زدہ۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"میں اپنے یا تمہارے لیے خوف زدہ نہیں ہوں۔ ان لوگوں
کے ارادوں سے خوف زدہ ہوں۔ جو لوگ سونا جھیل میں
ایک خونی مگرمچھ پہنچا سکتے ہیں، ایک شخص کو اس کے ذریعے اس
طرح قتل کرا سکتے ہیں کہ پولیس قتل کا خیال تک دل میں نہ لا سکے،
اور کسی پر قاتل ہونے کا شبہ نہ کر سکے، جو میرے ہاتھوں سے
میری آنکھوں میں دھول جھونک کر گھڑی لے جائیں، وہ معمولی
آدمی نہیں ہیں۔ خدا جانے یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ملک پر
ان کی وجہ سے کیا مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ میں اس خیال
سے پریشان ہوں۔"

"ارے، یہ ہوٹل والے لوگوں کو کیا کچھ کھلا پلا رہے ہیں
لوگو، دیکھو: یہ کیا ہے!"

اچانک فرزانہ پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ اس کے ہاتھ
میز پر موجود کھانے پینے کی طرف تھے — یہ چیزیں انھوں نے ہال
میں واپس آنے کے بعد دوبارہ منگوائی تھیں۔ اس کی چیخ نے
سب کو بوکھلا دیا — بیسیوں آدمی اٹھ کر ان کی میز کے گرد جمع
ہو گئے۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہے کھانے میں؟" مختلف آوازیں ابھریں۔
"یہ دیکھیے: مکھیوں کا پورا ایک گروہ۔" فرزانہ بلند آواز

میں کہا۔ اردگرد کھڑے لوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھانے پینے کی
چیزوں کو دیکھا۔۔ ان کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ چاروں میز
میں سے نکلے اور تیر کی طرح ہوٹل کے دروازے کی طرف چلے۔
سب لوگ اپنی کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے: لہٰذا ایسے
میں ان کا نشانہ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔ دروازے سے باہر نکلتے
ہی انہوں نے ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔۔ اتفاق کی بات
کہ ٹیکسی خالی تھی۔۔ وہ فوراً ان کی طرف آئی۔

اور جب چاروں ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی ایک سمت
میں چل پڑی تو انہوں نے چار بے ترنگے بدمعاشوں کو ہوٹل کے
دروازے سے نکل کر ایک کار میں بیٹھتے دیکھا۔

"لیجیے: تعاقب شروع ہوگیا۔" محمود بڑبڑایا۔

"پروا نہ کرو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے: "فرزانہ نے کمال کردیا۔
ورنہ آج ہم میں سے ایک آدھ ضرور کم ہوگیا تھا۔"

"لیکن ابا جان، یہ تو کچھ اچھا نہیں ہوا۔" فاروق بولا۔

"کیا اچھا نہیں ہوا، یہ کہ ہم چاروں بال بال بچ گئے۔"
انہوں نے فاروق کو تیز نظروں سے گھورا۔

"جی نہیں، میرا مطلب ہے، ہم تو جواد زبیری کے کوارٹر کا
معائنہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"فکر نہ کرو، یہ کام بھی ہم ضرور کریں گے، لیکن میرا خیال

ہے، نہیں اس کے کوارٹر سے بھی کوئی سراغ نہیں ملے گا، کیونکہ ہاورڈ
کے آدمی پہلے ہی کوارٹر کو کھنگال چکے ہوں گے۔"

"ابا جان، میں ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ ملک میں ان
دنوں سمگلنگ کا بہت زور ہے۔ کیا گھڑیوں کی سمگلنگ بھی ہو رہی
ہے؟"

"ہاں، گھڑیاں بھی سمگل کی جا رہی ہیں۔ بہت قیمتی قسم کی گھڑیاں
خفیہ راستوں سے ملک میں لائی جا رہی ہیں: اس طرح حکومت کو
نقصان پہنچ رہا ہے، لیکن تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟"

"میں اس گھڑی کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جو جواد زبیری
کی کلائی سے ملی تھی اور پھر اسے اڑا لیا گیا۔۔ متعلقہ آفیسرز کو وہ
گھڑی دکھا کر ہم یہ معلوم کر سکتے تھے کہ آیا وہ گھڑی سمگل شدہ تو
نہیں ہے۔"

"ہوں، بات دل کو لگتی ہے، شاید وہ اسی لیے اڑا لی گئی۔ تو
کیا ہاورڈ واقعی سمگلنگ کا کاروبار کرتا ہے اور یہ بات غلط نہیں
کہ وہ اس کاروبار کا بادشاہ ہے۔"

"تعاقب میں آنے والی کار بہت نزدیک آگئی ہے ابا جان۔"
محمود نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا تیز چلو بھئی، ہمارے پیچھے موت کے ہرکارے لگے ہوئے
ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے ڈرائیور سے کہا۔

"کیا چکر ہے جناب؟" ڈرائیور پریشان ہو کر بولا۔

"چکر بہت خطرناک ہے۔ میرا تعلق محکمہ سراغرسانی سے ہے۔ ہمارے کچھ دشمن تعاقب میں ہیں۔ اگر تم تیز ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرو تو انہیں آسانی سے پیچھے چھوڑ سکتے ہو۔"

"اچھی بات ہے، لیکن مجھے ڈر ہے، کہیں میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔"

"فکر نہ کرو۔ تم کسی پریشانی میں نہیں پڑو گے۔"

ڈرائیور نے رفتار بڑھا دی۔ درمیانی فاصلہ بڑھنے لگا، لیکن پھر پچھلی کار کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ اور وہ پہلے کی نسبت اور تیزی سے نزدیک آنے لگی۔

"ڈرائیور صاحب، یہ آپ کی مہارت کو للکار رہے ہیں۔"

"مجھے اپنی گاڑی کا فکر پڑا ہوا ہے۔ ایسے کھیل بہت خطرناک ہوتے ہیں۔" ڈرائیور بولا۔

"ارے بھئی فکر نہ کریں۔ اگر گاڑی کو کچھ ہو گیا، تو نقصان میں پورا کروں گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو یہ لیجیے۔"

اُس نے کہا اور رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ ٹیکسی سڑک پر اچھلنے لگی۔ ایک موڑ پر ٹریفک سارجنٹ نے سیٹی بجا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا، کیونکہ کار مقررہ رفتار سے بہت تیز تھی۔

"روکنا مت، نتیجے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور بڑھتا چلا گیا۔

سارجنٹ نے پیچھے آنے والی کار کو بھی رکنے کا اشارہ کیا، لیکن وہ بھی نہ رکی۔ اب اس نے اپنی موٹر سائیکل سنبھالی اور دونوں کے پیچھے ڈال دی۔

"لیجیے، سارجنٹ صاحب بھی ہمارے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔" فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ اب تعاقب کرنے والے ہم پر فائر نہیں کر سکیں گے۔"

"لیکن آخر یہ تعاقب کب تک جاری رہے گا؟" فرزانہ بولی۔

"جب تک کسی ایک کار کا پٹرول ختم نہیں ہو جاتا۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"ہم شہر سے باہر نکل آئے ہیں جناب۔" ڈرائیور نے گویا انہیں اطلاع دی۔

"پروا نہ کرو، ابھی تو شاید ہمیں ملک سے بھی باہر نکلنا پڑے۔" فاروق بولا۔

"فاروق، کیا بے تکی ہانک رہے ہو۔" محمود بولا۔

"اتنی رفتار سے چلتے ہوئے تک کی کمال سے لاؤں۔"

"دھت تیرے کی۔ اسے ایسے میں بھی چین نہیں۔" محمود نے

جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"اور تمہیں بھی کہاں چین ہے۔ ران پر ہاتھ مار بیٹھے ہو۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہائیں ہائیں فرزانہ، تم فاروق کا ساتھ دے رہی ہو۔" محمود نے آنکھیں نکالیں۔

"نہیں تو، میں تو اس وقت ٹیکسی کا ساتھ دے رہی ہوں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"بھئی واہ، یہ ہوا نا جواب۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"جی نہیں، اسے کہتے ہیں، سوال گندم جواب چنا۔" محمود بھی پٹ سے بولا۔

"لیجیے، اب ٹیکسی میں گندم اور چنے بھی لے آئے۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"باتوں میں تم سے بازی لے جانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"یہ تقریباً کہاں سے آ کودا، مکمل طور پر ناممکن کیوں نہیں ہے؟" فاروق مسکرایا۔ اس کا جواب سُن کر انسپکٹر جمشید بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اسی وقت وہ چونک اُٹھے۔ ٹیکسی کی رفتار اچانک کم ہو گئی تھی۔ انہوں نے سامنے دیکھا، سڑک پر ایک بہت بھاری پتھر بیچوں بیچ پڑا تھا اور اس کے دائیں اور بائیں طرف سے ٹیکسی نکال لے جانا

ناممکن تھا، کیونکہ سڑک کے دونوں طرف کھائیاں تھیں اور پھر پتھر کے نزدیک پہنچتے ہی ٹیکسی رک گئی۔ ڈرائیور نے پریشان ہو کر پیچھے دیکھا۔ پچھلی کار آندھی اور طوفان کی طرح ان کی طرف چلی آ رہی تھی۔

(۱۰)

"فوراً نیچے چھلانگیں لگا دو اور لڑھکتے ہوئے درختوں کی اوٹ لے لو۔ ڈرائیور صاحب، آپ بھی یہی کریں گے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے دروازہ کھولا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ فوراً ہی ان پر فائر کیا گیا۔ لیکن وہ لڑھکتے چلے گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے چھلانگیں لگانے میں دیر نہ لگائی۔ ان پر بھی گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ تینوں کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں۔ گولیاں ان کے دائیں بائیں اور اوپر سے گزر گئی تھیں۔ ڈرائیور نے چھلانگ لگانے کی ہمت نہ کی، وہ سیٹ کے نیچے دبک گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ ساتھ ہی چاروں بدمعاش کار سے چھلانگیں مار کر نکل آئے۔ ان میں سے ایک نے گرج دار آواز میں کہا:

"گھیر لو انہیں یہ جانے نہ پائیں۔"

وہ درختوں کی طرف بڑھے ہی تھے کہ پیچھے سے سارجنٹ کی آواز

ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے، یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم کس قانون کے تحت فائرنگ کر رہے ہو؟ میں تمہیں گرفتار کرنے کے لیے آ رہا ہوں۔ اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اس پر بھی ایک فائر ہوا اور وہ دھپ سے نیچے گر گیا۔ اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی۔ حملہ آوروں نے دیکھا، وہ بے بس ہو چکا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے گولی لگ گئی تھی۔

"ایک تو گیا۔" حملہ آوروں میں سے ایک کے منہ سے نکلا۔

"لیکن اسے شکار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں تو ان چاروں کو ختم کرنا ہے۔ ہر حال میں۔ باس کا یہی حکم ہے۔"

"فائر کرتے ہوئے آگے بڑھو۔" دوسرے نے کہا۔

جنگل میں فائروں کی آواز گونجنے لگی۔ پرندوں کی خوف زدہ آوازوں نے پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ کھیل آدھ گھنٹے تک جاری رہا، لیکن فائرنگ کے جواب میں چاروں غنڈوں کو کوئی چیخ سنائی نہ دی۔ وہ جنگل میں بہت دور نکل آئے تھے۔ آخر مایوس ہو کر واپس پلٹے اور سڑک پر آ گئے۔ جہاں منظر جوں کا توں تھا۔ اگلی ٹیکسی اسی جگہ کھڑی تھی۔ سارجنٹ بھی اسی جگہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" چاروں غنڈوں میں سے ایک نے کہا۔

"جلدی بتاؤ۔ ورنہ ہم ان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور باس ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ٹھہرو، اسی جگہ ٹھہرو اور درختوں پر نظر رکھو۔" یہ کہہ کر پہلا ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے سر اندر ڈال کر دیکھا۔ ڈرائیور سیٹ کے نیچے دبکا ہوا تھا۔

"ڈرائیور صاحب، باہر نکل آئیں۔" اس نے نرم آواز میں کہا۔

"کک، کیوں؟" اس نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"باہر نکل آؤ گے تو بتاؤں گا نا۔"

"مم، میں نہیں نکلتا باہر۔" ڈرائیور نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"تو پھر میں گولی چلاتا ہوں۔"

"ارے باپ رے۔ ٹھہرو، میں باہر آ رہا ہوں۔"

ڈرائیور کے نیچے اترتے ہی اس نے اپنے پستول کی نالی اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"ارے، ارے، یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"خاموش رہو، اور اس طرف چلو۔" وہ اسے دھکیلتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس لایا۔

"کیا ارادہ ہے؟" اس کے ساتھی نے کچھ نہ سمجھ کر پوچھا۔

"دیکھتے جاؤ۔" اس نے مسکرا کر کہا اور پھر جنگل کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولا:

"مسٹر جمشید، تم جہاں کہیں بھی ہو، سامنے آ جاؤ، کیونکہ اس وقت تمہاری ٹیکسی کا ڈرائیور میرے پستول کی زد میں ہے۔ پستول کی نال اس کی کنپٹی پر ہے، اگر تم ظاہر نہ ہوئے تو میں اس بیگناہ ڈرائیور کو گولی مار کر ہلاک کر دوں گا اور اس کا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔"

"کیا بے وقوفی ہے، بھلا وہ کیوں ظاہر ہونے لگا۔ ڈرائیور مرتا ہے تو مرے۔" اس کے ساتھی نے منہ بنایا۔

"تم نہیں جانتے، بعض لوگ بہت غیرت مند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بدلے میں جب کسی بے گناہ کو مرتے دیکھتے ہیں تو خود کو مرنے کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔" پہلے نے کہا۔

"بے وقوفی کی بات نہ کرو، وہ کیوں خود کو موت کے حوالے کرنے لگا۔" دوسرے نے کہا۔

"تجربہ کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ ٹھہرو، مجھے اس سے بات کر لینے دو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پھر جنگل کی طرف کیا اور بولا:

"ہیلو مسٹر جمشید، میں دس تک گنوں گا۔ اگر تم اس پر بھی ظاہر نہ ہوئے تو میں ڈرائیور کی کھوپڑی میں گولی اتار دوں گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ڈرائیور کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ادھر اس نے کہنا شروع کیا:

"ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ۔" چھ سے آگے وہ نہ گن سکا۔ اسی وقت جنگل میں ایک آواز ابھری تھی:

"ٹھہرو، میں آ رہا ہوں۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ نے دیکھا، انسپکٹر جمشید درخت کی اوٹ سے نکل کر غنڈوں کے سامنے آ گئے تھے۔

"بہت خوب، اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے آؤ۔"

"آؤ بھئی، تم بھی آؤ۔" انسپکٹر جمشید ان کی طرف منہ کر کے بولے۔ چاروں سڑک کی طرف چل پڑے۔ اس عالم میں بھی ان کے سینے تنے ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ دو منٹ بعد وہ ان چاروں کے عین سامنے پہنچ گئے۔

"تم نے دیکھا جنگو، یہ کتنے باغیرت ثابت ہوئے۔" پہلے بد معاش نے کہا۔

"کمال ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، یہ ترکیب کارگر ہو گی۔" دوسرے نے حیران ہو کر کہا۔

اب پہلے نے پستول ڈرائیور کی کنپٹی سے ہٹا لیا۔ اس نے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے پستول کا رخ ان کی طرف کر دیا۔ ہر ایک کی طرف ایک نال اٹھی ہوئی تھی۔ موت ان سے چند قدم

کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

"تم واقعی ایک بہادر انسان ہو۔ تم نے ایک ڈرائیور کی زندگی بچانے کے لیے خود کو اور اپنے بچوں کو پیش کر دیا۔"

"میں نے ایک ڈرائیور کے لیے نہیں، ایک انسان کے لیے ایسا کیا ہے۔ میرے نزدیک پیشہ کوئی چیز نہیں، اہمیت انسانیت کو حاصل ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھا، اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ ہمارے باس کا حکم یہی ہے۔"

"ٹھہرو، کیا تم میرے چند سوالات کے جوابات نہیں دے سکتے۔ تم اسے مرنے والوں کی آخری خواہش سمجھ سکتے ہو۔"

"پوچھو، اگر جواب دے سکا تو ضرور جواب دوں گا۔"

"کیا تمہیں ہمارے قتل کا حکم ہاورڈ نے دیا تھا۔"

"نہیں، ہمارے باس نے۔ اور ہم نہیں جانتے، باس کون ہے۔"

"کیا ہاورڈ واقعی سمگلروں کا بادشاہ ہے؟"

"یہ بات بھی مجھے نہیں معلوم۔" اُس نے کہا۔

"تمہارا باس کہاں بیٹھتا ہے؟"

"اس کا دفتر ہوٹل المارا میں ہی ہے، لیکن وہ ہاورڈ نہیں ہے۔"

"یار کیوں جھوٹ بولتے ہو۔"

"بھلا میں تم سے کیوں جھوٹ بولوں گا۔ ایک مرنے والے شخص ے جھوٹ بول کر مجھے کیا فائدہ ہو گا۔"

"گویا تم میرے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ یہ تو کوئی مزے دار بات نہ ہوئی۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی مایوسی تھی۔

"اب اس میں میرا کیا قصور؟ تمہارے سوال ہی ایسے ہیں۔" اُس نے کہا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"باس ہمارا بہت بے چینی سے انتظار کر رہا ہو گا۔ اب سوالات کا یہ سلسلہ ختم۔ اور موت کا سلسلہ شروع۔ چلو بھئی، ہیں ایک ساتھ فائر کرتے ہیں۔"

ان کی انگلیاں ٹریگروں پر دباؤ ڈالنے لگیں۔ انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن یہ بات یقینی نہیں تھی کہ وہ بچ ہی جائیں گے۔ گولیاں انہیں لگ بھی سکتی تھیں۔ اچانک ایک فائر کی آواز گونجی۔ اور پہلے بدمعاش کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ گولی اُس کی پیشانی پر لگی تھی۔

اس کے تینوں ساتھیوں نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ حیرت انہیں اس بات پر تھی کہ گولی کدھر سے آئی، کیونکہ انسپکٹر جمشید اور ان کے بچوں کے پاس تو پستول تھے نہیں، ٹیکسی ڈرائیور ان کے

پاس ہی کھڑا کانپ رہا تھا— انہوں نے چونک کر سارجنٹ کی
لاش کی طرف دیکھا— اسی وقت تین فائر اور ہوئے اور انہوں
گرنے سے پہلے دیکھ لیا کہ فائر سارجنٹ نے کیے تھے۔

چوری کی واردات

پانسہ آناً فاناً پلٹا تھا اور ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا
کہ اس طرح پلٹے گا۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ وہ صرف یہ کر
سکتے تھے کہ فائر ہونے سے ایک لمحہ پہلے گرتے اور لڑھکنیاں کھاتے
ایک بار پھر درختوں کی اوٹ میں چلے جاتے۔ لیکن ظاہر ہے، اس
طرح وہ کب تک بچ سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سارجنٹ
نے اس وقت کمال کر دکھایا تھا— سب لوگ اسے مردہ خیال کر رہے
تھے۔ اور اتنی دیر تک دم سادھے پڑے رہنا بھی آسان نہیں تھا۔
چنانچہ حملہ آوروں کے پستولوں پر قبضہ کرنے کے بعد انسپکٹر جمشید اس
سے بولے:

"بہت خوب سارجنٹ، آپ نے بہت شاندار کام دکھایا— کل
کے اخبارات آپ کے اس کارنامے کی خبر پہلے صفحات پر شائع کریں
گے۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کون ہیں اور ان لوگوں کو آپ سے

کیا دشمنی ہے؟" سارجنٹ کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"یہ باتیں تو ہم بعد میں بھی کر لیں گے۔ پہلے تو ہمیں ان لوگوں کو باندھ لینا چاہیے۔ کہیں ہوش میں آنے کے بعد یہ کسی پریشانی کا باعث نہ بنیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میرا خیال ہے، اب یہ کسی پریشانی کا باعث نہیں بن سکیں گے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچا ہوگا۔"

"نہیں بھئی، ایسا نہ کہو، ان سے ہمیں ابھی بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ان چاروں کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دیکھا، ان میں سے دو ختم ہو چکے تھے اور دو شدید زخمی تھے۔ چاروں پستول قبضے میں کر لیے گئے۔ سارجنٹ انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، لیکن جب انسپکٹر جمشید نے اُسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو وہ دھک سے رہ گیا اور پھر کچھ نہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا سا قافلہ واپس روانہ ہوا۔ زخمیوں کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ نگرانی کے لیے پولیس کے ذمے دار لوگ مقرر کیے گئے۔ مرنے والوں کو مردہ خانے بھجوا دیا گیا۔ اس دوران انہوں نے حامد کی مزاج پرسی بھی کی۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ وہاں سے واپس پلٹے تو ڈاکٹروں کی کوشش سے دونوں زخمیوں کو ہوش آ گیا تھا۔ انہوں نے انسپکٹر جمشید کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"ہیلو دوستو، کیا حال ہے؟" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولے۔

"تم اس وقت پولیس کے ہسپتال میں ہو۔ صحت یاب ہونے کے بعد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو گے۔ تم میں سے دو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ تمہارے ساتھ رعایت برتی جا سکتی ہے، بشرطیکہ تم اپنے باس کے بارے میں سچ سچ بتا دو، وہ ہوٹل المارا کے کون سے کمرے میں ملے گا۔ اس کا نام کیا ہے۔ اس کی شکل صورت کیسی ہے، وغیرہ وغیرہ۔"

"ہمیں کچھ نہیں معلوم، ہم نے آج تک اُس کی شکل نہیں دیکھی۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا یہ سچ نہیں کہ تمہارا باس ہاورڈ ہے؟"

"نہیں، ہاورڈ ہوٹل کی آخری منزل کے آخری کمرے میں رہتا ہے، جب کہ ہم اپنے باس سے بات کرنے کے لیے ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۹ میں جاتے ہیں۔"

"آج سے چند دن پہلے تم نے سونا جھیل میں کسی جواد زبیری نامی آدمی کو پھینکا تھا؟"

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"تم خود ہوٹل کے کونسے کمرے میں رہتے ہو؟"

"کسی کمرے میں نہیں۔ ہم ضرورت کے وقت احکامات لینے اپنے

باس کے کمرے میں جاتے ہیں اور بس، وہ ہمیں عام طور پر فون پر ہی ہدایات دیتا رہتا ہے۔"

"وہ تم سے کیا کام لیتا ہے؟"

"عام طور پر ایسے ہی کام، جیسا آج لیا ہے۔"

"یعنی مار کاٹ کے کام — فلاں کو ختم کردو، فلاں کی پٹائی کردو وغیرہ۔"

"جی ہاں، بالکل یہی بات ہے۔"

"کیا اس نے کبھی ہاورڈ کے بارے میں بھی کوئی ہدایت دی ہے؟"

"جی نہیں۔" اس نے کہا۔

"خیر، اگر تمہاری اطلاعات غلط ثابت ہوئیں تو تم نقصان میں رہو گے — دیکھ لو، سوچ لو، اگر کچھ اور بتانا ہو تو بتا سکتے ہو۔"

"جی نہیں، بتانے کے لیے میرے پاس اور کچھ نہیں۔"

"اچھی بات ہے — اب تم لوگ آرام کرو۔ میں ہوٹل المارا کا جائزہ لیتا ہوں جا کر۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکل کر انہوں نے ڈیوٹی پر موجود آفیسر سے کہا۔

"کوئی شخص بھی ان دونوں سے ملنے نہ پائے۔ یہ بھی دھیان رہے کہ اس سے ملنے والے نرس یا ڈاکٹر کے لباس میں بھی آ سکتے ہیں — ہو سکتا ہے، ایسا کوئی شخص آئے اور ان دونوں کو ختم کر کے چلتا بنے؛ لہذا جب تک آپ نرس یا ڈاکٹر کا شناختی

کارڈ نہ دیکھ لیں، کسی کو اندر نہ جانے دیں۔"

"بہت بہتر، میں ایسا ہی کروں گا۔"

"آؤ بھئی چلیں۔" انہوں نے مڑ کر محمود، فاروق اور فرزانہ سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک بار پھر ہوٹل المارا کے سامنے پہنچ چکے تھے — انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر کچھ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت جھلکنے لگی — لیکن انہوں نے کسی کی طرف توجہ نہ دی — اور سیدھے لفٹ کی طرف چلے گئے — انہوں نے اپنے کمروں میں سے پہلے ایک کا تالا کھولا — اور پھر دھک سے رہ گئے — ان کا سامان الٹ پلٹ پڑا تھا — بستر کی چادریں بھی الٹ پلٹ دی گئی تھیں —

کسی نے کمرے کی بے دردی سے تلاشی لی تھی — یہ دیکھ کر وہ تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھے، تالا کھولا تو اس کمرے میں بھی یہی منظر نظر آیا — دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید کاؤنٹر کلرک کا نمبر گھما رہے تھے —

"کمرہ نمبر ۴۳۱ سے جمشید بول رہا ہوں — اپنے مینجر کو فوراً یہاں بھیجیے — کسی نے ہماری عدم موجودگی میں ہمارے کمروں کی تلاشی لی ہے اور میرے لاکھوں روپے کے ہیرے غائب ہیں۔"

"جی، کیا فرمایا آپ نے؟" کاؤنٹر کلرک نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"جی ہاں، مینیجر صاحب کو اوپر بھیجیے — اگر وہ نہ ہوں تو اس واردات کی اطلاع مسٹر ہاورڈ کو دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ میں صبح سویرے عدالت میں مقدمہ دائر کرنے والا ہوں۔"

"اوہو، آپ ذرا ٹھہریے جناب، ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے — میں مینیجر صاحب کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔" کاؤنٹر کلرک نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بہت بہتر۔" انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا —

تھوڑی دیر بعد ٹی کومب ان کے کمرے میں نظر آیا — وہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا —

"میرا تو خیال تھا، اب آپ لوگ اس ہوٹل میں کبھی نظر نہیں آئیں گے۔"

"تو کیا اسی لیے ہمارے سامان کی تلاشی لے لی گئی ہے؟" انسپکٹر جمشید تیز آواز میں بولے۔

"نہیں، تلاشی لینے کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"تب پھر پولیس کو بلوائیے، تاکہ چوری کی رپورٹ درج کرائی جا سکے —"

"ضرور، ضرور — مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر گھمانے لگا — جلد ہی سلسلہ مل گیا اور وہ بولا:

"ہیلو سہراب شاہ، ہوٹل کے کمرہ نمبر چار سو تیس میں چوری کی واردات ہو گئی ہے، مہربانی فرما کر چلے آئیے۔" پھر دوسری طرف کی بات سن کر اس نے ریسیور رکھ دیا —

"سہراب شاہ ابھی چند منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا جناب۔"

"ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۱۹ میں کون رہتا ہے؟"

"کیوں؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا —

"یونہی، کیا آپ نہیں بتائیں گے؟"

"اس کمرے میں کوئی بھی نہیں رہتا — دراصل اس کمرے میں کوئی ٹھہرنا پسند ہی نہیں کرتا — اور نہ ہم اسے کرائے پر دیتے ہیں۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس لیے کہ لوگوں کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ یہ کمرہ آسیب زدہ ہے — جب بھی اسے کرائے پر دیتے ہیں، اس میں ٹھہرنے والے کو عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتی ہیں اور وہ کمرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔"

"اوہو، تو یہ بات ہے — تو کیا اس کمرے پر تالا لگا رہتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہم نے کئی بار دروازے پر تالا لگایا، لیکن تالا ہر بار کھلا ملتا ہے — اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ لوگوں کا خیال ٹھیک ہے۔" اس نے کہا —

"تب تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ وہ کمرہ مجھے
کرائے پر دے دیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں — آسیب زدہ کمرہ کرائے پر لے
کر آپ کیا کریں گے۔"

"مجھے بھوتوں سے کشتی لڑنے کا بہت شوق ہے۔ اس وقت
تک بڑے بڑے بھوتوں کو بھگا چکا ہوں میں۔"

"خیر خیر، اس بارے میں بعد میں غور کیا جائے گا۔ پہلے
آپ کی چوری کا معاملہ تو طے ہو۔"

چند منٹ بعد ایک بچھو کے ڈنک کی شکل کی موچھوں والا
آدمی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا — اس نے اندر
داخل ہوتے ہی کہا:

"ہیلو مسٹر ڈی کومب، کیا واقعی یہاں چوری ہو گئی ہے۔"

"ان صاحب کا تو یہی کہنا ہے۔"

"ابھی جب ہم کمروں میں داخل ہوئے تو تمام سامان الٹ
پلٹ پڑا تھا؛ گویا بری طرح تلاشی لی گئی ہے — ہم اپنے ساتھ
تقریباً دو لاکھ روپے کے ہیرے لائے تھے — اب وہ ہیرے یہاں
نہیں ہیں۔"

"ارے باپ رے، دو لاکھ کے ہیرے — مسٹر ڈی کومب، یہ
تو بہت بڑی چوری ہو گئی — لیکن اس بات کا آپ کے گاہکوں کے

پاس کیا ثبوت ہے کہ ان کے پاس واقعی دو لاکھ روپے کے ہیرے
تھے۔"

"ہمارے پاس دو لاکھ سے زائد کے ہیرے تھے — زائد ہیرے
ہماری انگلیوں، ٹائی پنوں اور ہیر کلپ پر موجود تھے، اس لیے
چوری نہیں ہو سکے — اگر آپ کو یہ شک ہے کہ ہمارے ہیرے
نقلی ہیں تو آپ کسی جوہری کو بلا کر تسلی کر سکتے ہیں۔"

"ہوں، بات تو پتے کی کہی۔" سہراب شاہ نے ان کی انگلی،
ٹائی پنوں کو گھورتے ہوئے کہا — "اچھی بات ہے — آپ چوری
ہونے والے ہیروں کی تعداد اور سائز بتائیں اور یہ بھی کہ آپ کو
کس پر شک ہے؟"

"بہت بہتر۔" انہوں نے کہا اور ہیروں کی تعداد اور سائز
نوٹ کرانے لگے — اس کے بعد بولے:

"مجھے اس ہوٹل کے مالک مسٹر ہاورڈ پر شک ہے۔"

"کیا؟" سہراب شاہ چلا اٹھا —

○

چند لمحے کے لیے وہ انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا،
کچھ یہی حال ڈی کومب کا تھا — آخر اس نے کہا:

"آپ ہوش میں تو ہیں مسٹر جمشید؟"

"جی ہاں، بالکل ہوش میں ہوں — میرے اس شک کی میرے پاس بہت بڑی وجہ ہے اور اس کے گواہ مسٹر ڈی کومب بھی ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں — آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

اس پر انہوں نے تفصیل سے بتادیا کہ کس طرح مسٹر ہاورڈ ہوٹل میں آیا اور پھر انہیں زبردستی اپنے کمرے میں لے گیا، پھر اپنے آدمی ہیری سے ان پر حملہ کرانا چاہا، لیکن مقابلے میں ہیری کو شکست ہوئی — یہ سُن کر سہراب شاہ زور سے ہنسا:

"آپ نے ہیری کو شکست دی — شاید آپ جاگتے میں خواب دیکھنے کے عادی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ سہراب شاہ کو بری طرح گھورنے لگے —

"مطلب یہ کہ میں ہیری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت شاندار باکسر ہے — آپ جیسوں کو تو وہ بہت آسانی سے اٹھا کر پھینک سکتا ہے — لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے اسے شکست دے دی تھی۔"

"مسٹر ڈی کومب سے پوچھیے کہ کیا ہوا تھا؟" انہوں نے کہا —

"میں بتاتا ہوں جناب، مسٹر ہاورڈ نے انہیں واقعی اپنے کمرے

میں بلایا تھا، لیکن زبردستی نہیں — یہ اپنے پیروں پر چل کر ان کے کمرے تک گئے تھے — مسٹر ہاورڈ ان سے کوئی کاروباری بات چیت کرنا چاہتے تھے — لیکن یہ بگڑ گئے — انہوں نے مسٹر ہاورڈ پر حملہ کرنا چاہا — آپ جانتے ہی ہیں، مسٹر ہاورڈ نے ہیری کو باڈی گارڈ رکھا ہوا ہے، بس وہ درمیان میں آگیا اور یہ دونوں آپس میں بھڑ گئے — ویسے یہ درست ہے کہ انہوں نے ہیری کو گرادیا تھا۔"

"کیا؟ مسٹر ڈی کومب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" سہراب شاہ نے آنکھیں نکالیں —

"جی، حقیقت یہی ہے۔"

"خیر، دیکھا جائے گا — میں نے رپورٹ درج کرلی ہے — آپ اس پر دستخط کردیں۔" یہ کہہ کر سہراب شاہ نے کاغذات ان کی طرف بڑھا دیے — انہوں نے رپورٹ کا ایک ایک لفظ پڑھا اور پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے:

"رپورٹ آپ نے اس طرح درج نہیں کی، جس طرح میں نے آپ کو بتایا ہے — مہربانی فرما کر پوری تفصیل لکھیے، یہ بھی کہ میں نے مسٹر ہاورڈ پر شک کا اظہار کیا ہے۔"

"لیکن میں مسٹر ہاورڈ پر شک کے اظہار کا اندراج نہیں کر سکتا — وہ اس ہوٹل کے مالک ہیں۔"

"تو کیا ہوٹل کے مالک دو لاکھ کے ہیرے نہیں چرا سکتے؟"

"جی نہیں۔"

"تب پھر آپ لکھ کر دے دیں کہ آپ رپورٹ میری مرضی کے مطابق درج کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اگر میں غلط بیانی کروں گا تو اس کا نقصان مجھے اٹھانا پڑے گا۔"

"بہت بہتر۔ میں نام لکھے دیتا ہوں۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔

شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کے سامنے کوئی ان پڑھ اور ناواقف آدمی نہیں بیٹھا۔

"ہم تفتیش کریں گے اور آپ کے ہیرے برآمد کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔"

"جی ہاں، وہ تو صاف ظاہر ہے۔" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

سہراب شاہ، ڈی کومب کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

"ابا جان، آخر آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"بھئی، ہیرے واقعی چوری ہوئے ہیں؛ لہذا رپورٹ درج نہ کراتا تو کیا کرتا۔" انہوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا، پھر سرگوشی میں بولے:

"آج رات ہم کمرہ نمبر ۴۱۹ اور جواد زبیری کے کوارٹر میں جائیں گے۔ میرا خیال ہے۔ ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ فرزانہ

میرے ساتھ کمرہ نمبر چار سو انیس میں جائے گی۔ تم دونوں جواد زبیری کے کوارٹر کا جائزہ لینے جاؤ گے۔"

"جی بہت بہتر۔" انہوں نے کہا۔

ابھی تک معاملے کا سر پیر ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔ اور وہ حیران تھے کہ ان کے والد کر کیا رہے ہیں۔

آسیب زدہ کمرہ

رات کے گیارہ بجے انسپکٹر جمشید اور فرزانہ کمرہ نمبر چار سو انیس
کے سامنے پہنچے ۔ کمرے کا دروازہ بند تھا ۔ انہوں نے ہاتھ کا دباؤ
ڈالا تو کھل گیا ۔ دونوں بے دھڑک اندر داخل ہو گئے ۔ کمرہ بالکل
خالی تھا ۔ نہ کوئی فرنیچر تھا اور نہ کسی قسم کا سامان ، انہوں نے غسل
خانے کی طرف قدم بڑھائے ۔ غسل خانے کا دروازہ بھی کھول کر دیکھا ،
اس میں بھی کچھ نظر نہ آیا ۔ واپس مڑے تو کمرے کا دروازہ بند ہو
چکا تھا ۔

"لو بھئی فرزانہ ، آسیب نے ہمیں گھیر لیا ہے ۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے
"یہ تو بہت اچھی بات ہے ابا جان ۔" فرزانہ خوش ہو کر بولی ۔
"میں نے تمہارے ہیرے دیکھے ہیں ۔ وہ تو واقعی اصلی ہیں ۔
کہاں سے لیے تم نے ؟" ایک سرسراتی سی آواز سنائی دی ، جیسے کوئی
سسک سسک کر کہہ رہا ہو ۔ یہ آواز سن کر فرزانہ کو اپنے رونگٹے
کھڑے ہوتے محسوس ہوئے ۔ اسے سچ مچ ایسا لگا جیسے یہ الفاظ کسی

ت نے ہی ادا کیے ہوں ۔
"میرا ایک دوست ہے ، سمگلنگ کا مال خریدتا ہے ، اس سے
ے تھے ۔ ارے ، مگر تم کون ہو ۔ کہاں سے بول رہے ہو ؟"
"مسٹر ڈی کومب سے تم سن تو چکے ہو کہ یہ کمرہ آسیب زدہ
ہے ۔"
"ارے باپ رے ، تو تمہیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی ۔" انسپکٹر جمشید
ڈرے ڈرے لہجے میں بولے ۔
"ہاں ، اور سنو ، تمہارے ہیرے میں نے چرائے ہیں ۔ بے چارے
اورڈ پر شک نہ کرو ۔ وہ چوری کرنا کیا جانے ؛ لہذا اپنی رپورٹ
واپس لے لو ، کیونکہ پولیس مجھ سے تمہارے ہیرے واپس نہیں لے سکتی ۔"
"اچھ ۔ چھا ، واپس لے لوں گا ۔" انہوں نے ہکلا کر کہا ۔
فرزانہ کی بھی گھگھی بندھتی جا رہی تھی ۔ خوف سے اس کی آنکھیں
باہر کو ابلتی جا رہی تھیں ۔
"ویسے تم ہو طاقت ور آدمی ۔ تم نے ہیری کو اس طرح گرا
یا ، جیسے کوئی پہلوان کسی بچے کو گرا لیتا ہے ؛ لہذا میں تمہیں بہت
پسند کرنے لگا ہوں ۔ ہاں ، تمہارے اس دوست کا نام کیا ہے ، جو
ہیروں کی تجارت کرتا ہے ؟"
"اس کا نام ؟ لیکن تم اس کا نام پوچھ کر کیا کرو گے ؟"
"بس یونہی پوچھ رہا ہوں ۔"

"نہیں نہیں، میں اپنے دوست کا نام نہیں بتاؤں گا — تم اس کے ہیرے بھی چرا لوگے۔"

"ارے نہیں، میں اس کے ہیرے خرید لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"بھلا بھوت بھی خرید و فروخت کرتے ہیں۔" فرزانہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

"یہ تمہاری لڑکی ہے۔" آواز نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"بہت ہوشیار نظر آتی ہے، لیکن اس وقت مجھ سے خوف زدہ ہوگئی ہے، لیکن ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں — ہاں تو تم نے بتایا نہیں مسٹر جمشید، یہی نام ہے نا تمہارا۔" اس بار لہجے میں قدرے حیرت شامل تھی —

"ہاں، میرا نام یہی ہے۔"

"عجیب سا نام ہے — اس نام کا ایک سراغرساں ملک بھر میں بہت مشہور ہے۔ ارے کہیں تم وہی تو نہیں ہو؟"

"میں اور سراغرساں — یہ بھی ایک ہی رہی۔"

"اچھا خیر — تو اس دوست کا نام کیا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے، میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

"نام تو تمہیں بتانا ہی ہوگا دوست۔" آواز آئی —

"ہرگز نہیں، تم کچھ بھی کر لو — میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے — تمہارے تو فرشتے بھی نام بتائیں گے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی کمرے کی چھت میں ایک سوراخ میں سے سفید رنگ کا دھواں نکلنے لگا — انہوں نے فوراً ہی دھوئیں کی موجودگی کو محسوس کر لیا — اس کی بو بہت تیز تھی —

"ہم — ہم بے ہوش ہونے والے ہیں، فر......"

انسپکٹر جمشید کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا، پھر وہ دھڑام سے گرے اور بے ہوش ہو گئے — فرزانہ تو ان سے بھی پہلے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی —

○

انسپکٹر جمشید کو جواد زبیری کے کوارٹر کا نمبر معلوم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، لیکن ترکیب وہ بتا ہی چکے تھے — محمود نے متعلقہ تھانے کو فون کیا، دبے لہجے میں اپنا تعارف کرایا اور پھر بولا:

"آپ نے جواد زبیری کے کمرے کا معائنہ تو کیا ہوگا؟"

"جی ہاں۔" اس طرف سے جواب دیا گیا —

"پھر آپ کو کوئی خاص چیز ملی؟" اُس نے پوچھا۔

"جی نہیں، کچھ نہیں ملا — اغوا کے آثار بھی نہیں تھے — ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے جواد زبیری اپنی مرضی سے کہیں چلا گیا ہے۔"

"ہوں، ذرا ہم بھی اس کے کوارٹر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔
کیا آپ اس کے کوارٹر کا نمبر بتانا پسند کریں گے۔"

"کیوں نہیں، اس کے کوارٹر کا نمبر سولہ ہے۔ یہ پہلی قطار کا
آخری کوارٹر ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" محمود نے کہا اور ریسیور رکھتے ہوئے
فاروق سے بولا:

"چلو بھئی، کوارٹر کا نمبر تو معلوم ہو گیا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ کچھ تو معلوم ہوا۔ میرا تو خیال تھا کہ
اس کیس میں ہمیں سرے سے کچھ معلوم ہی نہیں ہو گا۔" فاروق
نے خوش ہو کر کہا۔

"تم ہمیشہ اوٹ پٹانگ باتیں کیوں سوچا کرتے ہو۔" محمود نے
بھنا کر کہا۔

"اور تم میری باتوں کو ہمیشہ اوٹ پٹانگ ہی کیوں سمجھا کرتے
ہو۔" فاروق نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ آؤ چلیں۔ باتیں تو ہم بعد میں
بھی کر لیں گے۔"

"یہ بات ہے تو پھر چلو۔"

دونوں لفٹ کے ذریعے ہال میں آئے۔ یہاں ابھی تک رونق تھی۔
تقریباً تمام میزیں بھری پڑی تھیں۔

"سوال یہ ہے کہ ہم یہ کس سے پوچھیں کہ ملازمین کے کوارٹرز کس
ان ہیں۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ بات بھی پولیس سٹیشن سے کیوں نہ معلوم کر لی؟" فاروق جل
ر بولا۔

"اس وقت میری عقل گھاس کھانے چلی گئی تھی۔" محمود بولا
ور پھر ایک بیرے کی طرف بڑھا۔

"ملازمین کے کوارٹر کس طرف ہیں؟"

"ہال سے باہر نکل جائیے اور ہوٹل کی پچھلی سمت میں چلے
جائیے۔ آپ کوارٹرز تک پہنچ جائیں گے۔" اس نے کہا، پھر چونک
ر بولا۔

"لیکن آپ کوارٹرز کا پتا کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ہمیں ایک ملازم سے اپنی چند گمشدہ چیزوں کے بارے میں
معلوم کرنا ہے۔" محمود نے جلدی سے کہا اور پھر دروازے کی طرف
بڑھ گیا۔

فاروق نے بھی تیزی دکھائی اور بیرے کو کوئی اور سوال کرنے
ی مہلت نہ مل سکی۔ دونوں ہال کے دروازے سے باہر نکلے اور پچھلی
رف چل پڑے۔ انہوں نے دیکھا، کوارٹرز کی پہلی قطار میں کل سولہ
کوارٹر تھے۔ وہ آخری یعنی سولہویں کوارٹر کی طرف بڑھے۔ اس کے
دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ محمود نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور

تالے میں چابیاں گھمانے لگا — آخر چند منٹ کی کوشش کے بعد تالا
کھل گیا — دونوں اندر داخل ہوئے اور دیوار ٹٹول کر سوئچ آن کر
دیا — کمرے میں روشنی ہوگئی — انہوں نے دیکھا کہ فرش پر گرد کی
تہہ جمی تھی — ہر طرف بے ترتیبی کا راج تھا — انہوں نے احتیاط سے
ایک ایک چیز کی تلاشی لینا شروع کی —

کمرے میں ایک چارپائی، ایک چھوٹی سی میز اور دو پرانی سی
کرسیاں تھیں — دیوار میں دو الماریاں تھیں — ان میں سے ایک میں
کچھ برتن تھے اور دوسری میں پرانی قسم کی کتابیں وغیرہ تھیں — یہ
الماری انہیں اپنے مطلب کی نظر آئی — انہوں نے ایک ایک کرکے
تمام کتابیں دیکھنا شروع کیں — وہ باری باری کتابیں نیچے گراتے جا
رہے تھے — انہوں نے تمام کتابیں دیکھ ڈالیں، لیکن کوئی کام کی
چیز، کوئی سراغ نہ ملا — اب انہوں نے ایک ایک کتاب کھول کر
دیکھنا شروع کی — اچانک ایک کتاب کے پہلے صفحے پر پنسل سے
لکھے ہوئے چند الفاظ پر ان کی نظریں جم گئیں — الفاظ یہ تھے:

"میں بہت عرصے تک غلط فہمی کا شکار رہا، جسے میں باس سمجھتا
رہا، وہ باس نہیں — باس تو کوئی اور ہی ہے — اُف خدا، یہ انکشاف
کس قدر حیرت انگیز ہے — ابھی یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ مجھے باس
کی شخصیت کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔"

کتاب پر لکھے ہوئے یہ الفاظ ان کے لیے بھی عجیب تھے۔ وہ

سوچ میں ڈوب گئے —

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" فاروق کے منہ سے نکلا —

"شاید یہ کسی گروہ کا رکن تھا۔ اس گروہ کا باس اپنے کارکنوں
کے سامنے نہیں آتا ہوگا — ایسے باسوں کے بارے میں کارکن خیالی
پلاؤ پکایا ہی کرتے ہیں؛ چنانچہ جواد زبیری بھی سوچتا رہا ہوگا کہ
باس فلاں آدمی ہے، لیکن کسی طرح اس نے اصل باس کو دیکھ لیا
اور اس نے یہ الفاظ یہاں لکھ دیے۔"

"یہ اندازہ تو ان الفاظ کو پڑھ کر ایک بے وقوف آدمی بھی
لگا سکتا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا —

"پھر تم نے اس کا مطلب کیوں پوچھا تھا۔" محمود جل کر بولا۔

"میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ آخر یہ جواد زبیری کرتا کیا تھا، کس
گروہ میں شامل تھا؟" فاروق بولا۔

"وہ بظاہر تو ہوٹل الماراکا بینڈ ماسٹر تھا، لیکن شاید وہ کسی جرائم
پیشہ گروہ سے بھی تعلق رکھتا تھا اور اب تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں
کہ یہ سارا چکر سمگلنگ کا ہے، کیونکہ اس کی کلائی پر پائی جانے والی
گھڑی سمگل شدہ ہے — اسی لیے اس گروہ کے ایک مرد اور ایک
عورت نے گھڑی اڑا لی۔"

"اور اس شہر کے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہاورڈ سمگلنگ کا بادشاہ
ہے۔" فاروق نے جلدی سے کہا —

"ہاں، جواد زبیری اس کی بجائے کسی اور کو باس خیال کرتا رہا ہو گا۔ کسی طرح اسے اچانک یہ معلوم ہو گیا کہ باس تو دراصل ہاورڈ ہے۔ اور ہاورڈ نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔" محمود نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہاورڈ کو باس خیال کرتا رہا ہو اور نکل آیا ہو باس کوئی اور۔" فاروق نے پر زور انداز میں کہا۔

"ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ خیر، یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے تو ہمیں یہ کتاب واپس الماری میں رکھ دینی چاہیے۔"

انہوں نے اس کتاب کے ساتھ دوسری کتابیں بھی الماری میں رکھ دیں اور جانے کے لیے مڑے، لیکن پھر ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ان کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔

دروازے میں، بیری کھڑا انہیں خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

ڈنگو

انہیں ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے میں پایا، لیکن یہ ہوٹل کا وہ کمرہ نہیں تھا، جس میں انہوں نے ایک سرسراتی آواز سے باتیں کی تھیں اور پھر سفید دھوئیں نے انہیں بے ہوش کر دیا تھا۔ دونوں ہڑبڑا کر اٹھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں دو پلنگ، دو کرسیاں اور ایک میز کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ انسپکٹر جمشید دروازے تک گئے۔ ہینڈل پکڑ کر کھینچا، لیکن دروازہ تو باہر سے بند تھا۔

"گویا ہم یہاں قیدی ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اور کیا ہم ہاورڈ کے قیدی ہیں؟" فرزانہ بولی۔

"شاید۔" وہ سوچ میں گم لہجے میں بولے۔

"اور یہ شخص ہم سے صرف آپ کے دوست کا نام اور پتا معلوم کرنا چاہتا ہے۔" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، فی الحال تو اس کے علاوہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"
یہ کہہ کر انہوں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گھڑی آٹھ بجا رہی
تھی۔ انہیں بہت حیرت ہوئی۔

"ارے، گھڑی تو آٹھ بجا رہی ہے۔ ہم اس کمرے میں رات
گیارہ بجے گئے تھے۔ پھر کیا اس وقت دن کے آٹھ بجے ہیں۔
اگر یہی بات ہے تو یہاں رات کا سماں کیوں ہے۔ یہ بلب کیوں
جل رہا ہے۔ یا پھر اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں۔ اس کا
مطلب یہ ہوا کہ ہم پورے اکیس گھنٹے بے ہوش رہے ہیں، لیکن
نہیں، یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ اس وقت ضرور دن کے آٹھ بجے ہیں۔"
انسپکٹر جمشید الجھن کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

"اس کا فیصلہ چار گھنٹے بعد ہو سکتا ہے۔ اگر گھڑی پر تاریخ نہ
بدلی تو اس وقت ضرور دن ہے۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن تمہیں چار گھنٹے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس
وقت دن کے آٹھ بجے ہیں اور تم لوگ نو گھنٹے بے ہوش رہے ہو۔"
وہی سرسراتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے، یہ تو یہاں بھی موجود ہے۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"انسپکٹر جمشید، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم
تھا کہ تم سے ان حالات میں ملاقات ہو گی۔ جب میں تمہیں سفید
دھوئیں سے بے ہوش کر رہا تھا، اس وقت بھی مجھے یہ معلوم نہیں

تھا کہ تم انسپکٹر جمشید ہو۔ یہ تو مجھے اس وقت معلوم ہوا، جب میرے
آدمی تمہیں اور تمہاری لڑکی کو اٹھا کر یہاں لائے اور انہوں
نے تمہارے چہروں کا جائزہ لیا تو میک اپ کا سراغ ملا، پھر
انہوں نے تمہارا میک اپ اتار دیا۔ لہذا اب تم دونوں اپنی
اصلی شکل صورت میں ہو؛ بہرحال میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔
امید ہے کہ تم یہاں گھبراہٹ محسوس نہیں کر رہے ہو گے۔"

"کیا یہ کوئی زمین دوز جگہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں، تمہارا اندازہ درست ہے۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہو تو تمہارے دونوں
لڑکوں کو بھی تم تک پہنچا دیا جائے۔" اس نے کہا۔

"اوہ، کیا وہ بھی تمہارے قبضے میں آ چکے ہیں۔"

"نہیں، وہ تمہاری تلاش کے سلسلے میں پریشان پھر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، مہربانی فرما کر انہیں بھی یہیں پہنچا دو۔ ان
کے بغیر ہم تنہائی محسوس کر رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کچھ سوچ
کر بولے۔

"اچھی بات ہے۔ میں ابھی پتا کراتا ہوں، وہ کہاں ہیں۔
تھوڑی دیر بعد تمہیں ناشتا بھجوایا جائے گا۔ مہربانی فرما کر کوئی شرارت
کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے شرارت کرنے والے پسند نہیں ہیں۔"

اگر مجھے پہلے ہی یہ معلوم ہو جاتا کہ تم دراصل انسپکٹر جمشید ہو تو کبھی
تمہیں یہاں نہ لاتا — تم اس کمرے میں سر پٹکتے رہ جاتے اور
تنگ آ کر واپس چلے جاتے — بُرا ہو اس جواد زبیری کا جس کی
لاش کا پنجر تمہیں مل گیا اور تم یہاں تک آ پہنچے؛ ورنہ میں
نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم سے بھی آمنا سامنا ہو سکتا ہے۔
خیر کوئی بات نہیں — حالات کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔
تم یہاں خود کو بالکل بے بس محسوس کرو گے، کیونکہ نکلنے کا راستہ
تلاش نہیں کر سکو گے۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا —

"کیا تم مسٹر ہاورڈ ہو؟" فرزانہ نے گفتگو میں دخل دیا —

"نہیں، میں ہاورڈ نہیں ہوں — ہاورڈ بے چارے کو تو
لوگ مفت میں ہی سمگلروں کا بادشاہ سمجھ بیٹھے ہیں — اصل میں
تو میں ہوں سمگلروں کا بادشاہ۔" اس نے ہنس کر کہا — انسپکٹر جمشید
اور فرزانہ نے محسوس کیا — اس نے زبردستی اپنی شخصیت پر پردہ
ڈالنے کی کوشش کی ہے؛ ورنہ وہ ہے ہاورڈ ہی —

"اچھا خیر، ذرا جلدی سے ناشتا بھجواؤ، بہت بھوک لگی ہے۔"

"ناشتا ابھی آتا ہے — تو اپنے کسی سمگلر دوست کے بارے میں تم
نے جھوٹ بولا تھا۔"

"ہاں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے — "ہمارے ہیرے کہاں ہیں؟"

"میرے پاس ہیں، کیا تمہارے پاس ایسے اور بھی ہیرے ہیں؟"

"کیوں نہیں، لیکن تم ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکو گے، کیونکہ وہ
ایک بنک کے لاکر میں رکھے ہیں اور بنک کے لاکر کو صرف میں ہی
کھول سکتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، ایسے بے شمار ہیرے میرے پیروں میں
پڑے رہتے ہیں — ہیروں سے بھی کچھ قیمتی چیزیں سمگل ہو کر مجھ
تک پہنچتی ہیں — پورے ملک میں اس وقت جس قدر بھی سمگلنگ
ہو رہی ہے، اس کا مرکز میں ہوں۔"

"تو کیا پورے ملک میں سمگلروں کا ایک ہی گروہ کام کر رہا
ہے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"نہیں، مختلف گروہ کام کر رہے ہیں، لیکن سب سے بڑا
گروہ میرا ہے — مختلف ہاتھوں سے گزر کر مال آخر کار مجھ تک
پہنچتا ہے اور میرے آدمی اسے پورے ملک میں فروخت کرتے ہیں۔
اس طرح میری آمدنی کروڑوں روپے سالانہ ہے — اوہو، کوئی
پیغام آنے والا ہے، معاف کرنا انسپکٹر۔"

اس کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہو گئی — دونوں سوچ میں گم
تھے — اچانک دروازہ کھلا اور ایک شخص ناشتے کی ٹرے لیے
اندر داخل ہوا — انسپکٹر جمشید اس آدمی کو دیکھ کر حیران ہوئے بغیر
نہ رہ سکے — ان کے منہ سے نکلا:

"ٹنگو، یہ تم ہو؟"

(۰)

"تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟" ہیری سانپ کی طرح پھنکارا۔

"جواد زبیری کے کوارٹر کا جائزہ لے رہے تھے، کیا تم اتنا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے — شاید عقل سے بالکل پیدل ہو۔ بہتر ہو گا، عقل کے گھوڑے پر سوار ہو کر آؤ اور پھر ہم سے بات کرو۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا — یوں دونوں کو ہیری سے خوف محسوس ہو رہا تھا —

"میں اور عقل سے پیدل — تمہاری یہ جرأت — ٹھہرو ابھی بتاتا ہوں — کون کتنا عقل مند ہے؟" ہیری غصے میں آ گیا۔

"ارے ارے، اس میں غصہ کھانے والی کیا بات ہے — کیا تمہیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا — کھا کھا کر ہاتھی تو ہو رہے ہو۔" فاروق نے یہ سوچ کر کہا کہ اگر ہیری پر غصہ سوار ہو گیا تو اس سے مقابلہ ان کے لیے خوف ناک ثابت نہیں ہو گا، کیونکہ غصے میں آدمی کی عقل ماری جاتی ہے — احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے —

"تم نے — تم نے مجھے ہاتھی کہا — ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ وہ سچ مچ ہاتھیوں کی طرح جھومتا ہوا ان پر حملہ آور ہوا — محمود اور

فاروق بوکھلا کر دائیں اور بائیں ہٹ گئے اور وہ اپنی جھونک میں سیدھا دیوار تک چلا گیا، پلٹا تو اس کے شکار دو طرف کھڑے تھے۔ ایک لمحے کے لیے وہ چکرا گیا کہ کیا کرے، پھر فاروق کی طرف بڑھا — یہ دیکھ کر محمود نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور سر کی ٹکر اس کی کمر میں رسید کی، لیکن اس ٹکر سے بھلا اس کا کیا بگڑتا — اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور فاروق کی طرف چلا۔ محمود بوکھلا گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک کرسی اٹھا لی — عین اس وقت جب کہ ہیری کا مکا فاروق کے سر کا رخ کر رہا تھا اور فاروق جھکائی دینے کی فکر میں تھا کرسی ہیری کے سر پر پوری قوت سے پڑی۔ وہ جھلا کر مڑا، اس کے مڑتے ہی فاروق بلا کی تیزی سے جھکا اور اس کی بائیں ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی — اس وقت تک ہیری دایاں پاؤں اٹھا چکا تھا — نتیجہ یہ کہ وہ دھڑام سے منہ کے بل گرا — بس پھر کیا تھا، محمود نے دو تین بار کرسی سر سے بلند کی اور اس پر دے ماری — وہ کسی بھینسے کی طرح ڈکرایا — ادھر فاروق نے دوسری کرسی اٹھا لی اور اس کی ٹانگوں پر دے ماری —

"اب بتاؤ، تمہیں ہمارے پیچھے کس نے بھیجا ہے، نہیں تو کرسی آتی سر پر۔" محمود نے گویا اسے دھمکی دی —

"مسٹر ہاورڈ نے — انہوں نے تم لوگوں کی نگرانی میرے ذمے لگائی تھی۔" ہیری نے جلدی سے کہا —

"وہ ہماری نگرانی کیوں کرانا چاہتا ہے؟"

"تم لوگ جواد زبیری کی فکر میں ہو۔ ادھر پولیس بھی اس کی گمشدگی کے سلسلے میں مسٹر ہاورڈ پر شبہ کر رہی ہے؛ لہذا مسٹر ہاورڈ اس سلسلے میں فکرمند ہیں۔ اسی لیے انہوں نے تمہاری نگرانی پر مجھے لگا دیا تھا، لیکن میں تمہارے والد اور بہن کے بارے میں نہیں جان سکا کہ وہ کہاں نکل گئے اور کب؟"

"تم ان کے بارے میں جان بھی نہیں سکو گے۔" محمود نے کہا اور ایک اور کرسی اس کے سر پر دے ماری۔ کم بخت بہت سخت جان تھا۔ اتنی کرسیاں کھانے کے بعد بھی بے ہوش نہیں ہوا تھا، اگرچہ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔

"یار، آخر تم کتنی کرسیاں کھانے کے بعد بے ہوش ہو گے۔" فاروق نے جھنجلا کر کہا۔

"ان کرسیوں سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اگر مجھے بے ہوش کرنا ہے تو یہ میز اٹھا کر میرے سر پر دے مارو۔" اُس نے پُرخلوص انداز میں مشورہ دیا۔

"ارے نہیں یار، کہیں تم مر ہی نہ جاؤ۔"

"یقین کرو، میں اس میز کے وار سے مروں گا نہیں، بس بے ہوش ہو جاؤں گا۔" اس نے ہنس کر کہا۔ اس کی ہنسی بھی بہت خوفناک تھی۔ کچھ بہنے والے خون نے خوفناک بنا دیا تھا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو، جیسے سچ مچ بے ہوش ہونا چاہتے ہو۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔"

"آخر کیوں؟ بے ہوش ہو کر تمہیں کیا مل جائے گا؟"

"مسٹر ہاورڈ مجھے ہوش میں پا کر زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جب انہیں یہ معلوم ہو گا کہ میں ہوش میں تھا اور تم دونوں میرے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے۔"

"تو کیا مسٹر ہاورڈ نے تمہیں ختم کرنے کا حکم دے رکھا ہے؟"

"نہیں، لیکن تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ مسٹر ہاورڈ پولیس کو کیا جواب دیں گے؟"

"اگر یہ بات ہے، تب تو ہم تمہیں ہرگز بے ہوش نہیں کریں گے۔ آؤ بھئی محمود چلیں۔"

"ہاں چلو۔" اس نے کہا اور کرسیاں ہیری کے سر پر پھینک تیزی سے باہر نکل آئے۔ تقریباً دوڑتے ہوئے وہ ہوٹل کے دروازے پر پہنچے اور پھر لفٹ کے ذریعے اپنے کمروں تک پہنچے، لیکن دونوں میں سے کسی کمرے میں بھی انسپکٹر جمشید اور فرزانہ نہیں تھے۔

"ہائیں، ابا جان اور فرزانہ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ وہ تو کمرہ نمبر چار سو انیس کا صرف جائزہ لینے گئے تھے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"شاید جائزہ لمبا ہوگیا۔" فاروق بڑبڑایا۔

پھر دونوں چار سو انیس نمبر کمرے کے سامنے پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ لیکن تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ انہوں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ دونوں اندر داخل ہوئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اندر انسپکٹر جمشید اور فرزانہ نہیں تھے۔ کمرہ بالکل خالی پڑا تھا۔

"حیرت ہے، دونوں اپنے کمروں میں بھی نہیں ہیں اور یہاں بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے یہی پروگرام بنایا تھا کہ وہ دونوں اس کمرے کا جائزہ لیں گے اور ہم کوارٹر کا۔ پھر واپس اپنے کمروں میں آجائیں گے۔ پھر وہ کہاں گئے؟" محمود نے بڑبڑاتے کے انداز میں کہا۔

"مجھے اس کمرے میں خوف محسوس ہو رہا ہے۔ خدا کے لیے اس میں سے باہر نکل چلو۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔ محمود اس کے انداز سے ڈر گیا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"کیا تم پر آسیب کا اثر ہو گیا ہے؟" اُس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"خدا جانے کیا بات ہے۔ کمرے میں مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں وہم ہوا تھا۔ آسیب کی باتیں سُن کر ایسے وہم ہو ہی

جاتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"چلو خیر، وہم ہی سہی۔ ابا جان اور فرزانہ تو اندر ہیں ہی نہیں، پھر ہم اندر کیوں ٹھہریں۔"

"لیکن ابھی ہم نے غسل خانے کا جائزہ نہیں لیا۔ کیا خبر وہ غسل خانے میں ہوں۔" محمود نے کہا۔

"تو ایسا کرتے ہیں، تم اندر جا کر دیکھ آؤ، میں باہر ٹھہرتا ہوں۔"

"عجیب بزدل ہو تم بھی۔ اچھا خیر، میں ہی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر محمود پھر کمرے میں داخل ہو گیا اور غسل خانے کا جائزہ لینے کے بعد پورے کمرے کو بھی غور سے دیکھا، لیکن کوئی عجیب بات محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے سوچا، ضرور فاروق کو وہم ہو گیا ہے۔ وہ مسکراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر فاروق کو بہت حیرت ہوئی۔ اس نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے، تم پر بھی آسیب کا اثر ہو گیا ہے، جو بلا وجہ مسکرا رہے ہو۔"

"نہیں، میں تمہارے بارے میں سوچ کر مسکرا رہا تھا، تمہیں ضرور وہم ہو گیا ہے۔ اندر تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"خیر خیر، یہ بتاؤ، غسلخانے میں کچھ نظر آیا یا نہیں۔"

"نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

"تب پھر ہمیں انہیں پورے ہوٹل میں تلاش کرنا ہوگا۔ اور اس کے بعد ہم شہر میں تلاش کریں گے۔" فاروق بولا۔

"شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ ابا جان اور فرزانہ بچے تو نہیں ہیں، جنہیں ہم تلاش کرتے پھریں گے۔"

"لیکن ان کا اس طرح غائب ہونا مجھے بُری طرح کھٹک رہا ہے۔ ان کا پروگرام واپس اپنے کمروں میں پہنچنے کا تھا۔" فاروق بولا۔

"ہوں، خیر آؤ۔ پہلے ہم انکل اکرام کو فون کرتے ہیں۔ وہ پورے ہوٹل میں تلاشی کا بندوبست کرلیں گے۔ اگر نہ ملے تو ہم تلاش کا دائرہ وسیع کردیں گے۔"

وہ اپنے کمرے میں آئے۔ چوکیدار کے ذریعے اکرام کو فون پر بُلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اکرام ان کے پاس موجود تھا۔ حالات سُننے کے بعد اس نے متعلقہ تھانے میں فون کرکے سہراب شاہ اور کانسٹیبلوں کو بُلا لیا، پھر پورے ہوٹل میں تلاشی شروع ہوئی۔ نہ کہیں ڈی کومب کا پتا تھا، نہ ہاورڈ کا۔ دوسرے ملازم اپنے کمروں میں سوئے پڑے تھے۔ ایسے میں وہ صرف اتنا ہی کرسکتے تھے کہ ہوٹل کے اردگرد اور باغ میں دیکھ لیتے۔ سب لوگوں کو جگانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے ہاورڈ کے کمرے کی بھی تلاشی لی، لیکن کوئی نہیں تھا۔ اسی طرح دن نکل آیا، لیکن ان

تلاش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ دن نکلنے پر ہوٹل کے تمام کمروں
دیکھ ڈالا گیا۔ ڈی کومب بھی آگیا تھا۔ اس سے بھی ملاقات
ئی۔ اس کے کمرے کو بھی دیکھا گیا۔ ہیری کو جواد زبیری کے
رے سے زخمی حالت میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ
ں نے محمود اور فاروق پر حملہ کیا تھا اور انہیں جان سے مار
لنے کی کوشش کی تھی۔ پورے ہوٹل میں بھی جب انسپکٹر جمشید
ر فرزانہ نہ ملے تو شہر میں تلاش کا پروگرام بنایا گیا۔ اس سلسلے میں
رام کو دفتر جانا پڑا، تاکہ آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب
و اطلاع دے سکے۔ محمود اور فاروق ہوٹل میں ہی رہ گئے۔ ایسے
ں انہیں ایک بار پھر کمرہ نمبر ۲۱۹ کا خیال آیا۔ ان کے قدم خود بخود
س سمت میں اٹھنے لگے۔

زمین دوز دنیا

ناشتا لانے والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر حیرت زدہ رہ گیا۔

" انسپکٹر جمشید، آپ اور یہاں ہیں۔"

" ہاں، یہ میں ہوں۔ میں آج تمہیں دس سال بعد دیکھ رہا ہوں۔ تم قتل کے جرم میں سزا کاٹ رہے تھے۔ پھر تم ایک دن جیل سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، اس کے بعد پولیس کو تمہارا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔"

" جی ہاں، سراغ ملتا بھی کیسے۔ جیل سے بھاگ کر میں نے ایک دوست کے ہاں پناہ لی تھی۔ وہ سمگلروں کے گروہ میں شامل تھا؛ چنانچہ اس نے مجھے بھی اس گروہ میں شامل کرا دیا اور مجھے یہاں دس سال ہو گئے ہیں۔"

" گویا تم دس سال سے اس زمین دوز دنیا میں رہ رہے ہو۔"

" نہیں، ہم باہر بھی جاتے ہیں۔ مال لانے اور لے جانے کے

سلسلے میں ہمیں باہر بھی جانا پڑتا ہے۔"

" گویا تم باہر جانے کا راستہ جانتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے اُسے غور دیکھتے ہوئے کہا۔

" نہیں، باس کے سوا کوئی خفیہ راستے کے بارے میں نہیں جانتا۔ ہم میں سے جب کچھ لوگوں کو باہر جانا پڑتا ہے تو وہ باس کے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس کمرے میں سب کو اپنے چہروں پر ربڑ کے توبڑے چڑھانے پڑتے ہیں۔ اس طرح ان کی آنکھیں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہتیں۔ اس حالت میں توبڑا چہرے سے ہٹانے کی سزا موت ہے۔ باس انہیں خود ہاتھ پکڑ کر باہر نکلنے کے راستے پر پہنچا دیتا ہے۔ ایک دن ایک کارکن نے توبڑا چہرے سے ہٹا دیا تھا، بس اس دن کے بعد اس کی صورت دکھائی نہیں دی۔"

" کہیں اس کا نام جواد زبیری تو نہیں تھا؟"

" ہاں، آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

" اس کی لاش ہی ہمیں یہاں تک لائی ہے۔" وہ مسکرائے:

" کیا تم یہاں خوش ہو؟"

" جیل کی کوٹھڑی سے یہ جگہ بہت اچھی ہے۔ کھانے پینے کو بھی خوب ملتا ہے۔" اُس نے خوش ہو کر کہا۔

"انسان جب کوئی جرم کر بیٹھتا ہے تو اسے سزا ضرور ملتی ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی جا کر چھپ جائے۔"

"یہ بھی تو ایک سزا ہی ہے انسپکٹر صاحب کہ میں آزاد دنیا میں سانس نہیں لے سکتا — اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے دُور رہنے پر مجبور ہوں۔"

"لیکن خوش بھی ہو۔" انسپکٹر جمشید طنزیہ لہجے میں بولے۔

"اتنا خوش بھی نہیں۔" اس نے بھی مسکرا کر کہا: "خیر، آپ ناشتا کیجیے۔"

"کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو، باس کون ہے؟"

"عام خیال یہ ہے کہ باس ہاورڈ کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ صرف خیال ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"ہوں، اس زمین دوز دنیا میں کتنے کمرے ہیں؟"

"یہاں کمروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ پوری ایک بستی آباد ہے۔" اُس نے کہا۔

"اور کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کمروں میں سے باس کا کمرہ کونسا ہے؟"

"ہاں، معلوم ہے، لیکن بغیر اجازت اس کمرے میں داخل ہونے کی سزا بھی موت ہے۔" اُس نے خوف سے کانپ کر کہا۔

"کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ باس کا کمرہ کونسا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ بتانا چاہیے یا نہیں — بہتر ہوگا کہ یہ بات آپ باس سے ہی پوچھ لیں۔" اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"خیر، ہم اس سے ہی معلوم کرلیں گے۔"

اس کے بعد ڈنگو چلا گیا۔

ناشتا بدمزہ سا تھا، لیکن انہیں کھانا پڑا — ڈنگو جاتے وقت کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر گیا تھا — اس لیے وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھے — آدھ گھنٹے بعد دروازہ پھر کھلا اور ڈنگو اندر داخل ہوا — اس نے ٹرے اٹھانے کے بعد کہا:

"باس نے حکم دیا ہے کہ آپ کو کمرے سے باہر آنے جانے کی اجازت ہے — اب آپ اس کمرے کے قیدی نہیں ہیں، لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ باس کی نظر اس زمین دوز بستی کے چپے چپے پر ہے، وہ ہر جگہ کی آواز بخوبی سن سکتا ہے۔ آپ کسی کارکن سے کوئی بات نہیں کریں گے — کسی سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ آپ کو باس کے کمرے کے بارے میں نہیں بتایا جائے گا۔"

"بہت بہتر — کیا ہم تم سے بھی بات نہیں کر سکتے؟"

"یہ میرے اور آپ کے درمیان آخری گفت گو تھی — کھانا اور ناشتا آپ کو ضرور پہنچاؤں گا، لیکن کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔" یہ

کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ دونوں اسے جاتے ہوئے
دیکھتے رہے، پھر خود بھی اُٹھے اور کمرے سے نکلے۔ انہوں نے دیکھا،
اُن کے سامنے دُور تک ایک گلی سی چلی گئی تھی۔ اس گلی کے
دونوں طرف کمرے ہی کمرے تھے۔ گلی میں بلب روشن تھے۔ آگے
جا کر گلی دائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ وہ اس گلی میں قدم اٹھانے
لگے، یہاں تک کہ دائیں طرف مڑ گئے۔ اب انہوں نے خود کو ایک
کھلے میدان میں پایا۔ اس میدان کے بعد پھر کئی گلیاں نظر آئیں؛
گویا یہاں گلیوں اور کمروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ ان گلیوں میں
چکراتے پھرے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے بھول بھلیوں میں
پھنس کر رہ گئے ہوں۔

"حیرت ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہوٹل المبارا کے
نیچے ایک اتنی بڑی بستی بھی آباد ہو سکتی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بستی ہوٹل المبارا کے
نیچے ہی ہے؟"

"کم از کم اس بستی کا سلسلہ اس ہوٹل کے نیچے سے ہی شروع
ہوا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"یہ تو شاید میلوں میں پھیلی ہوئی ہے۔"

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور اس بستی میں ہم پھنس کر
رہ گئے ہیں۔ نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔" وہ بولے۔

"کیا آپ مایوس ہو گئے ہیں؟" فرزانہ نے اداس لہجے میں کہا۔

"نہیں، مایوسی گناہ ہے۔ خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہونا
چاہیے۔ آؤ آگے چلتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو سہی، یہ سلسلہ کتنا
طویل ہے۔"

وہ آگے بڑھتے رہے۔ تقریباً پندرہ منٹ تک چلنے کے
بعد کمروں اور گلیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا؛ لہٰذا انہیں واپس مڑنا پڑا۔
اس دوران انہیں بے شمار آدمی چلتے پھرتے اور کمروں میں آتے
جاتے نظر آئے تھے۔ کسی نے ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں
دیکھا تھا، نہ ہی انہوں نے ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش
کی؛ البتہ وہ ان کے چہروں کو غور سے ضرور دیکھتے رہے تھے۔

"میرا خیال ہے، یہ سب لوگ سزا یافتہ ہیں۔ جیلوں سے
بھاگے ہوئے ہیں۔ جرم کرنے کے بعد قانون سے چھپتے چھپاتے
اس زمین دوز آبادی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اُف خدا،
یہ کتنا بڑا گروہ ہے۔ اس پورے گروہ پر ایک آدمی کی حکومت
ہے۔ اس آدمی کو یہ لوگ باس کہہ کر بلاتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے،
وہ کون ہے۔ ان میں سے اتفاق سے ایک شخص نے یہ جان لینے
کی کوشش کی تھی کہ باس کون ہے۔ اسے ان لوگوں کے باس
نے مگرمچھ کی خوراک بنا دیا۔"

"یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ جھیل میں مگرمچھ کیس

طرح پہنچ گیا اور ان لوگوں کے باس کو کس طرح معلوم ہو گیا کہ جھیل میں ایک عدد مگرمچھ بھی موجود ہے۔" فرزانہ نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بات واقعی عجیب ہے — ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا۔ میں محمود اور فاروق کے بارے میں غور کر رہا ہوں — باس نے ان دونوں کو بھی ہمارے پاس پہنچانے کا وعدہ کیا ہے، لیکن اب میں سوچ رہا ہوں — کاش، وہ دونوں اس کے ہاتھ نہ لگیں۔ یہاں آکر وہ بھلا کیا کر سکیں گے۔ ہم دونوں کی طرح وہ بھی بے بس ہوں گے۔"

"لیکن باہر رہ کر بھی وہ کیا کر سکیں گے؟" فرزانہ بولی۔

"اس بستی کا ایک راستہ ضرور ہوٹل المارا کے کمرہ نمبر ۴۱۹ میں کھلتا ہے۔ وہ اس کمرے میں ضرور جائیں گے اور اسی وقت شاید باس کے آدمی انہیں ہم تک پہنچا دیں، لیکن اگر انہوں نے اس کمرے کا رُخ نہ کیا تو شاید وہ کچھ کر سکیں۔" انسپکٹر جمشید پرخیال انداز میں بولے۔

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ ان حالات میں وہ کیا کر سکیں گے۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ وہ کچھ کام دکھا سکتے ہیں۔"

"تو کیا ہم یہاں کوئی کام نہیں دکھا سکیں گے۔"

"ضرور، کیوں نہیں — لیکن ذرا سوچو، اس چالاک آدمی نے

اپنے گرد تمام لوگ ایسے جمع کیے ہیں جو قانون سے بھاگے ہوئے ہیں — یہ لوگ روشن دنیا میں جانا پسند نہیں کریں گے۔ اس وقت یہ جاتے ہیں تو باس کا سہارا لے کر، لیکن اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ باس اب ان کی پشت پر نہیں ہے تو یہ اوپر جانے کی جرأت بھی نہیں کریں گے — لہذا ان حالات میں یہ سب لوگ باس کا ساتھ دیں گے اور اس کے ایک اشارے پر ہماری تکا بوٹی کر دیں گے — اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان بھلا ہماری حیثیت ہی کیا ہے — یہ لوگ ایک ایک مکا بھی اگر مار دیں تو ہمارا کچومر نکل جائے — اس کے باوجود میں مایوس نہیں ہوں — آنکھیں اور کان کھلے رکھو، موقع کی تاک میں رہو، ہم یہی کر سکتے ہیں اور بس۔" انہوں نے کہا۔

فرزانہ نے دیکھا، ان کے چہرے پر ان حالات میں بھی عزم کی ایک ایسی جھلک تھی جسے کوئی خوف شکست نہیں دے سکتا تھا۔

عین اسی وقت تیز الارم کی آواز ان کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی — آن کی آن میں سب اپنے کمروں سے نکل آئے — ایک ہل چل سی مچ گئی۔ کھلبلی سی مچ گئی — انسپکٹر جمشید اور فرزانہ اتنے بہت سے لوگوں کو کمروں سے نکلتے دیکھ کر حیران رہ گئے — وہ سب اس میدان کا رُخ کر رہے تھے جو گلیوں کے درمیان میں چھوڑا گیا تھا — ان دونوں کے قدم بھی خود بخود اس سمت میں اٹھنے لگے —

فاروق چلتے چلتے اچانک رُک گیا۔ محمود اس سے چند قدم آگے نکل گیا۔ پھر واپس مُڑا، تو فاروق کو بُت کی طرح ساکت کھڑے پایا۔

"کیوں، کیا سانپ سونگھ گیا ہے تمہیں۔"

"سانپ تو نہیں، ایک خیال ضرور سونگھ گیا ہے مجھے۔" فاروق نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ محمود نے اس کی طرف دیکھا اور چونک اُٹھا۔ وہ واقعی حد درجے سنجیدہ تھا۔

"خیر تو ہے، بہت سنجیدہ ہو۔" اُس نے کہا۔

"ہاں، میرا خیال ہے، ہم کمرہ نمبر چار سو انیس میں جا کر غلطی کریں گے۔ ابا جان اور فرزانہ اسی کمرے میں گئے تھے اور لوٹ کر نہیں آئے۔ اب اگر ہم بھی ان کے پاس پہنچ گئے تو کیا مزہ آئے گا۔ کیا خبر ہم ان کے پاس پہنچ کر ان کے کسی کام آ سکیں یا نہیں۔"

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو، ہم کیا کریں؟"

"کیوں نہ ہم سونا جھیل کی طرف چلیں۔"

"بھلا ہم سونا جھیل جا کر کیا کریں گے؟" محمود نے منہ بنایا۔

"یہ کیس سونا جھیل سے شروع ہوا تھا اور ہوٹل المارا تک جا پہنچا۔ ہوٹل المارا سے ابا جان اور فرزانہ غائب ہو گئے؛ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ہم بھی غائب ہو جائیں۔ میں کہتا ہوں جھیل کی طرف چلو۔" فاروق بولا۔

"اگرچہ تمہاری بات میں کوئی وزن نہیں، اور جھیل کی طرف جانا مجھے سوائے بے وقوفی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں تمہارا ساتھ دینے پر مجبور ہوں۔ شاید اس لیے کہ تم میرے بھائی ہو۔"

"یہ بات نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ تمہارا دل میری بات کو تسلیم کر رہا ہے۔ مجرموں کا سراغ یا ہوٹل المارا سے لگ سکتا ہے یا پھر سونا جھیل سے۔ ذرا سوچو، آخر سونا جھیل میں وہ مگرمچھ کہاں سے آ گیا تھا؟" فاروق نے کہا۔

"یہ بات تو میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں۔ جب سے مگرمچھ جھیل سے نکلا ہے، لیکن اب تک اس بات کا کوئی جواب نہیں سُوجھا۔"

"جب کہ مجھے سوجھ گیا ہے۔" فاروق نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"ہائیں، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے واقعی یہ بات سوجھ گئی ہے کہ مگرمچھ جھیل میں کس طرح آ گیا تھا۔" فاروق نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"ارے اگر سوجھ ہی گئی ہے تو بتاتے کیوں نہیں؟"

"بتاؤں گا ہرگز نہیں۔ سارا سسپنس ختم ہو جاتا ہے۔ بس تم میرے

ساتھ جھیل تک چلو، پھر دیکھو، خدا کیا کرتا ہے۔"

"تو بتا دینے میں کیا حرج ہے؟" محمود نے الجھ کر کہا۔

"میری عقل فالتو نہیں ہے۔ بہت دیر تک زور دے کر یہ بات سمجھ میں آئی ہے؛ لہذا تم بھی زور دو، کیونکہ میں جانتا ہوں، میری طرح تم بھی عقل سے پیدل نہیں ہو۔" فاروق مسکرایا۔

"یہ بات ہے تو ہرگز نہ بتانا۔ میں خود ہی سوچ لوں گا۔ آؤ چلیں۔ میں نے بھی کمرہ نمبر ۲۱۹ میں جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"عقل مندی کا تقاضا یہی ہے۔"

دونوں نے پہلے اپنے کمرے میں آکر اکرام کو فون کیا۔ انہیں بتایا کہ وہ سونا جھیل کی طرف جا رہے ہیں، پھر ہوٹل سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور جھیل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہوٹل المارا سے جھیل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ جلد ہی وہ جھیل کے نزدیک پہنچ گئے۔ انہوں نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور وہ چلی گئی۔ دونوں جھیل سے کچھ فاصلے پر اترے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اس وقت تک حرکت نہیں کی تھی، جب تک کہ ٹیکسی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھی۔ جونہی وہ غائب ہوئی، فاروق نے کہا۔

"محمود، ہمیں اس طرح چھپ کر جھیل تک پہنچنا ہے کہ ہم کسی کی نظروں میں نہ آئیں۔" فاروق نے پراسرار انداز میں کہا۔

"یہاں ہے ہی کون جس سے ہم چھپیں گے۔ تم اتنے پُراسرار

کیوں بن رہے ہو۔" محمود نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"تم بھی ایسے موقعوں پر اسی طرح پُراسرار بن جایا کرتے ہو۔ جب تمہیں کوئی بات سوجھ جاتی ہے تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ اتفاق سے آج مجھے ایک بات سوجھ گئی ہے تو میں تم سے انتقام کیوں نہ لوں۔"

"چلو خیر، یونہی سہی۔ لیکن ہم چھپیں کس سے؟"

"نظر نہ آنے والے کچھ لوگوں سے، لیکن وہ کسی وقت بھی نظر آسکتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"واقعی آج تم بہت عجیب باتیں کر رہے ہو۔ اچھا خیر، میں وہی کروں گا، جو تم کہو گے۔ کہیں تم بعد میں یہ نہ کہو میں نے تمہارا ساتھ اس لیے نہیں دیا کہ کہیں مہم کا سہرا تمہارے سر نہ بندھ جائے۔"

"اگر میرا ساتھ نہیں دو گے تو یہ الزام تو میں ضرور دوں گا تمہیں۔"

فاروق مسکرایا۔ محمود نے برا سا منہ بنایا اور دونوں آگے بڑھنے لگے۔ اچانک انہوں نے ایک زوردار چھپاکے کی آواز سنی۔ ساتھ ہی کسی کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ غڑاپ شڑاپ کی چند آوازیں آئیں۔

ہر کلائی پر گھڑی

زمین دوز آبادی کے کھلے میدان میں بے شمار آدمی جمع ہو
چکے تھے اور ابھی اور آ رہے تھے — میدان کے ایک طرف ایک
لکڑی کا اونچا تخت بچھا تھا — سب لوگ اس تخت کی طرف منہ کر
کرکے بیٹھتے جا رہے تھے — انسپکٹر جمشید اور فرزانہ ایک طرف کھڑے
یہ منظر دیکھ رہے تھے —

"فرزانہ، تم نے ایک بات محسوس کی ؟" اچانک انسپکٹر جمشید نے
سرگوشی کی —

"جی، آپ کا اشارہ کس طرف ہے ؟" فرزانہ نے چونک کر پوچھا۔

"ان میں سے ہر ایک کی کلائی پر ایک ایک گھڑی ضرور موجود
ہے اور یہ تمام گھڑیاں بالکل اسی قسم کی ہیں، جس قسم کی گھڑی ہمیں
جواد زبیری کی کلائی پر ملی تھی —" انہوں نے بتایا، اب فرزانہ نے
خاص طور پر کلائی پر بندھی گھڑیوں کو دیکھا اور پھر بولی :

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے —" اس نے حیرت زدہ آواز میں

کہا : "آخر یہ گھڑیوں کا کیا چکر ہے —"

"ضرور یہ خاص قسم کی گھڑیاں ہیں — یا پھر اس گروہ کے لوگ
نشانی کے طور پر ان گھڑیوں کو پہنتے ہیں — ملک میں اس قسم کی گھڑیاں
ملتی نہیں ہوں گی ؛ چنانچہ یہ گھڑیوں کے ساتھ ساتھ ان سے نشانی کا
کام بھی لے لیتے ہیں —" انہوں نے خیال ظاہر کیا —

"ضرور یہی بات ہے، لیکن ایک بات حلق سے نہیں اترتی —"
فرزانہ بولی : "یہ کہ جواد زبیری والی گھڑی کو حاصل کرنے کی ایسی کیا
ضرورت تھی — وہ اگر ہمارے پاس رہ جاتی تو اس گروہ یا گروہ کے
باس کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا ؟"

"بات سوچنے کی ہے ....." ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔
اسی وقت بھیڑ میں سے ایک لمبے قد کا آدمی نکل کر تخت پر چڑھ گیا
تھا — اسے دیکھ کر جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا — ایک دم موت کی
سی خاموشی چھا گئی — سب کے چہروں پر خوف دوڑ گیا، پھر تخت پر
چڑھنے والے کے ہونٹ ہلے :

"باس نے تم سب کو یہاں اس لیے جمع کیا ہے کہ آج پھر
ایک کارکن نے غداری کی ہے۔ اس نے باس کا چہرہ دیکھنے کے لیے ربڑ
کا توبڑا اپنے منہ پر سے ہٹا لیا تھا، لیکن باس کی نظروں سے اس کی یہ
حرکت چھپی نہ رہ سکی ؛ چنانچہ اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اسے
بھی وہی سزا دی جائے گی جو جواد زبیری کو دی گئی تھی، لیکن جواد زبیری

کو سزا دیتے وقت میرے ساتھیوں سے جو غلطی ہوئی، وہ غلطی اس بار نہیں ہوگی۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ اسے جھیل میں پھینکنے سے پہلے وہ اس کی کلائی سے گھڑی اتارنا بھول گئے تھے اور اس گھڑی کے نتیجے میں اس وقت انسپکٹر جمشید اور ان کی بیٹی اس زمین دوز آبادی میں موجود ہیں۔ ہمیں مجبوراً ان سے گھڑی حاصل کرنے کے لیے چکر چلانا پڑا، ورنہ زیادہ سے زیادہ ہوتا یہ کہ انسپکٹر جمشید جواد کے بھائی کا بیان سن کر ہوٹل المارا میں پہنچ جاتے اور تفتیش کے گھوڑے دوڑاتے رہتے، ہم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے، لیکن اس گھڑی کی وجہ سے انہوں نے جان لیا کہ ہوٹل المارا میں سمگلنگ کا کوئی چکر چل رہا ہے؛ لہذا یہ میک اپ میں وہاں پہنچ گئے اور اس حالت میں کہ ان کے پاس ہیرے بھی تھے۔ ہیرے باس کی کمزوری ہیں؛ چنانچہ وہ ان لوگوں کو یہاں اٹھا لائے۔ یہ یہاں پر لانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو دراصل انسپکٹر جمشید ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ سارا ہنگامہ اس گھڑی کی وجہ سے ہوا؛ لہذا اس مرتبہ گھڑی پہلے ہی اتار لی جائے گی۔ جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے۔ ہم ان گھڑیوں کے ذریعے پورے ملک میں کام کرنے والے لوگوں کو پہچان لیتے ہیں۔ ہوٹل میں ہمارے ساتھی موجود ہوتے ہیں۔ جوں ہی کوئی شخص مال لے کر پہنچتا ہے اور اس کی کلائی پر گھڑی ہوتی ہے، وہ اسے باس تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہم نے انسپکٹر جمشید کے قبضے میں گھڑی اس لیے نہ رہنے دی کہ اگر یہ اسے کلائی پر باندھ

کر میک اپ کر کے ہوٹل المارا میں آ پہنچے، تو ہمارے ساتھی ضرور غلط فہمی کا شکار ہو جائیں گے۔ بس اسی خوف کے پیش نظر گھڑی اڑائی گئی تھی اور یہ لوگ ہمارے پیچھے لگے۔ خیر، اب ان میں سے دو ہمارے قبضے میں ہیں اور باقی دو بھی بہت جلد ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۱۹ تک پہنچ جائیں گے اور وہاں سے باس انہیں نیچے لے آئے گا۔ اب میں اس شخص کا نام بتاؤں گا، جسے سزا دی جانے والی ہے۔ اس کا نام سنتے ہی سب لوگ اسے جکڑ لیں۔ اس کی گھڑی اتار لیں اور پھر میرے آٹھ خاص ساتھی اسے جھیل میں پھینک آنے کا فریضہ انجام دیں گے۔ ہاں تو دوستو، اس غدار اور بے ایمان کا نام ہے، ہانو۔"

اچانک ایک شور گونجا اور وہ لوگ ایک خوف ناک صورت والے آدمی کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے اسے جکڑ لیا۔ اس کی گھڑی اتار لی۔ ہانو بری طرح چیخ رہا تھا۔

"نہیں باس نہیں، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ میرے باپ کی بھی توبہ۔ دیکھو، میں نے گروہ کے لیے کتنے شاندار کام انجام دیے ہیں۔ مجھ سے یہ سلوک نہ کرو۔ مجھے مگرمچھ کی خوراک نہ بناؤ۔ مجھ پر رحم کرو باس، رحم کرو۔"

اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ بیسیوں ہاتھ اس پر پڑ رہے تھے۔ آخر اسے تختے تک پہنچا دیا گیا۔

"فرزانہ، میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ یہ کئی انسانوں کا قاتل

ہے۔ قدرت آج اس کے گناہوں کی سزا اسے دے رہی ہے۔ یہ قانون سے بچنے کے لیے جس کی پناہ میں آیا تھا، آج وہی اسے موت کی سزا دے رہا ہے۔ یہ فرزانہ خدا کی لاٹھی۔ اور یہ ہے گناہ اور جرم کا انجام۔" انسپکٹر جمشید جذباتی انداز میں کہتے چلے گئے۔

اسی وقت انہوں نے دیکھا، آٹھ آدمیوں نے مل کر ہالو کو رسیوں سے باندھ دیا تھا اور ہاتھوں پر سر سے بلند اٹھا کر ایک طرف چلنے لگے تھے۔

"آؤ فرزانہ، ہم ان کے پیچھے چلیں گے۔ یہ آٹھوں اسے جس کمرے میں لے کر جائیں گے، وہی کمرہ باس کا ہوگا۔ اور یہ معلوم ہونے کے بعد ہم بہت کچھ کر سکیں گے۔" انہوں نے دبی دبی پُرجوش آواز میں کہا۔

○

شڑاپ غڑاپ کی آوازوں کے بعد انہوں نے آٹھ آدمیوں کو کچھ فاصلے سے جنگل کی طرف جاتے دیکھا۔ انہوں نے سر جھیل کی طرف کر کے دیکھا۔ ایک شخص کا صرف سر انہیں نظر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سر بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ یہ دیکھ کر دونوں کانپ اٹھے۔ فاروق کے منہ سے لرزتی آواز میں نکلا:

"ایک اور شخص کو مگرمچھ کی خوراک بنا دیا گیا۔"

"مگرمچھ کی خوراک؟ مگر اب جھیل میں مگرمچھ کہاں رہ گیا ہے۔ اسے تو نکالا جا چکا ہے۔" محمود نے کہا۔ فاروق صرف مسکرا کر رہ گیا۔

اچانک محمود کے دماغ میں بجلی سی کوندی۔ اس کے منہ سے نکلا:

"اوہ، میں سمجھ گیا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ سمجھ گئے۔ آؤ، ان آٹھوں آدمیوں کے پیچھے چلیں۔"

دونوں ان کا تعاقب کرنے لگے۔ تقریباً سو گز چلنے کے بعد وہ انہیں گھنی جھاڑیوں میں گھستے نظر آئے اور جب وہ ان جھاڑیوں تک پہنچے تو آٹھوں آدمی غائب ہو چکے تھے۔

"ارے، وہ کہاں گئے؟" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"آہستہ بولو، شاید وہ جھاڑیوں میں چھپے ہوں۔"

دونوں احتیاط سے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ جھاڑیاں بے حد گھنی تھیں اور ان میں داخل ہونے سے پہلے یہ نظر آتا تھا کہ حد درجے دشوار گزار ہیں، بلکہ ان میں گھسنا بھی تقریباً ناممکن ہے، لیکن جب دونوں ان میں گھس گئے تو انہیں اندر ہی اندر ایک راستہ سا نظر آنے لگا۔ اس راستے کو دیکھ کر ان پر جوش کی حالت طاری ہوگئی۔ وہ

آگے بڑھتے چلے گئے — وہ آٹھ آدمی انہیں دوبارہ دکھائی نہیں دیے
تھے — تقریباً پانچ منٹ تک اس راستے پر چلنے کے بعد ایک جگہ
ان کے سامنے بہت ہی گھنی اور ٹیڑھی میڑھی جھاڑیاں آگئیں اور راستہ
بند ہو گیا —

"راستہ تو بند ہو گیا — اب کیا کریں؟"

فاروق نے پریشان ہو کر کہا — محمود نے کوئی جواب نہ دیا —
اس نے دائیں بائیں دیکھا — دائیں طرف زمین کے ساتھ اسے جھاڑیاں
نظر نہ آئیں تو وہ بیٹھ کر دیکھنے لگا — پھر پرجوش لہجے میں بولا:

"فاروق، یہاں ایک سُرنگ نما خلا موجود ہے — میں اس میں
اُتر رہا ہوں۔"

"خدا حافظ، اندر پہنچ کر خیریت کی اطلاع دینا۔" فاروق بولا۔

"تو کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟"

"تمہاری طرف سے خیریت کی اطلاع ملنے کے بعد۔" اس
نے کہا۔

"خیر، یونہی سہی۔"

یہ کہہ کر محمود سینے کے بل لیٹ گیا اور سر کی طرف سے اس خلا
میں داخل ہو گیا — آگے چل کر سوراخ بڑا ہو گیا اور وہ کھڑا ہونے
کے قابل ہو گیا — اب اس نے فاروق کو آواز دی:

"فاروق، آنا ہے تو آجاؤ — یہ تو واقعی سُرنگ ہے۔" اس نے

نچی آواز میں کہا —

"اگر یہ واقعی سُرنگ ہے تو پھر میں ضرور آؤں گا — بہت مدت
ہو گئی، کسی سُرنگ سے ملاقات نہیں ہوئی۔" فاروق نے کہا اور محمود
کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس تک پہنچ گیا — دونوں آگے بڑھنے
لگے — انہوں نے رفتار تیز کر دی تھی، لیکن قدموں کی آواز پیدا نہیں
ہونے دے رہے تھے اور پھر انہیں آٹھوں آدمی آگے جاتے ہوئے
نظر آ گئے — اب انہوں نے رفتار کم کر دی کہ کہیں وہ پلٹ کر نہ دیکھ
لیں —

سُرنگ میں اندھیرا نہیں تھا — تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زیرو
کے بلب لگے ہوئے تھے اور وہ روشن تھے — دونوں دیوار کے ساتھ
لگ کر چلنے لگے — سُرنگ کو دیکھ کر انہیں حیرت ہو رہی تھی — اسے
تیار کرنے میں کئی ماہ تو ضرور لگے ہوں گے — ایک جگہ انہوں نے
آٹھوں آدمیوں کو رُکتے دیکھا — اس جگہ ایک تار سا لٹکا ہوا تھا —
ان میں سے ایک نے تار پکڑ کر کھینچا، اور پھر انہوں نے ایک
دروازہ نمودار ہوتے دیکھا — دیکھتے ہی دیکھتے آٹھوں آدمی اس دروازے
میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے — اس کے ساتھ ہی خلا پُر
ہو گیا —

"اب ہم کیا کریں؟" فاروق بولا۔

"عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آئی جی صاحب کے ذریعے

پوری مدد لے کر یہاں آئیں اور ادھر کمرہ نمبر ۳۱۹ میں بھی محکمہ سراغرسانی
کے آدمی بھرے ہوئے ہونے چاہییں — تاکہ یہ لوگ کسی طرف سے بھی
فرار نہ ہو سکیں — بلکہ ہوٹل المارا کو بھی چاروں طرف سے گھیر لیا
جانا چاہیے ۔"

"ٹھیک ہے، ہمیں یہی کرنا ہوگا — یہ انتظام کرنے کے بعد ہم
اس تار کو پکڑ کر کھینچیں گے ۔"

اسی روز رات کو گیارہ بجے محمود اور فاروق پھر اس تار کے
قریب موجود تھے — ان کے پیچھے اکرام کے علاوہ بڑے بڑے آفیسر
اور مسلح کانسٹیبل بھی تھے — محمود کے تار کھینچتے ہی دروازہ نمودار ہوا۔
دونوں بے دھڑک اندر داخل ہو گئے — انہوں نے دیکھا، وہ ایک
بڑے سے کمرے میں تھے — اس کمرے میں ایک شخص پڑا سو رہا
تھا — اس پر نظر پڑتے ہی فاروق مسکرا اٹھا — محمود کو بھی کوئی حیرت
نہ ہوئی، کیونکہ دونوں پہلے ہی اس کے بارے میں اندازہ لگا چکے
تھے کہ باس یہی شخص ہوگا — ان کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔
محمود نے آگے بڑھ کر اندرونی دروازہ کھول دیا اور پھر چونک اٹھا۔
دوسری طرف انسپکٹر جمشید اور فرزانہ موجود تھے —

"بہت خوب، تو تم بھی یہاں تک پہنچ چکے ہو — میں ابھی
باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش شروع کرنے ہی لگا تھا — ارے آپ
لوگ بھی ہیں؟" وہ آئی جی صاحب کو دیکھ کر چونکے —

"ہاں، ہم پورا انتظام کر کے آئے ہیں ۔" آئی جی صاحب نے
کہا اور ساتھیوں کو اشارہ کیا — وہ باس کے کمرے کے دروازے سے
ہو کر اندر جانے لگے ۔ اور پھر ایک ایک کمرے میں پہنچ کر انہوں
نے سوتے ہوئے مجرموں پر پستول تان لیے — ان کے پستول قبضے
میں کر لیے گئے — ابھی تک ایک مجرم کی بھی آنکھ نہیں کھلی تھی —
وہ بے سدھ سو رہے تھے — ادھر انسپکٹر جمشید باس کی طرف بڑھے —

"اٹھیے شیر واقدی صاحب — کسے معلوم تھا کہ چڑیا گھر کا منتظم
سمگلروں کا بادشاہ ہو سکتا ہے ۔"

شیر واقدی کو جب جھنجوڑا گیا، تب کہیں جا کر اس کی آنکھیں
کھلیں — اور ایسی کھلیں کہ کھلی رہ گئیں — اسے دبوچ لیا گیا —
ایک ایک آدمی پر قابو پا لیا گیا — کمروں میں سمگل شدہ اتنا مال
بھرا ہوا تھا کہ ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں — ان میں نہ
صرف نشہ آور ادویات، ہیروئن وغیرہ تھیں، بلکہ ہیرے، گھڑیاں اور
نہ جانے کیا کچھ تھا — صرف ہیروئن کے بارے میں اندازہ لگایا گیا کہ
پچاس کروڑ روپے قیمت کی تو ضرور ہی ہوگی —

اور جب وہ سرنگ سے نکل رہے تھے تو فاروق کہہ رہا تھا:

"میرا خیال ہے اباجان، اس کیس کا سہرا تو آپ میرے سر
باندھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کریں گے — یہ میں تھا، جو محمود کو
کمرہ نمبر ۳۱۹ کی بجائے جھیل کی طرف لے گیا ۔"

" اس میں کوئی شک نہیں ابا جان ، لہٰذا میری درخواست ہے کہ آپ سہرا فاروق کے سر رہنے دیں ، کیونکہ بے چارے کو لے دے کے پہلی مرتبہ کوئی سہرا نصیب ہوا ہے ___ ہمارا کیا ہے ، ہمارے سر تو آئے دن سہرے بندھتے رہتے ہیں ___ محمود نے مسکرا کر کہا اور دوسرے بھی مسکرانے لگے ___ اس کی بات سُن کر فاروق کا منہ بن گیا ، بلکہ بن کیا گیا ، پھول گیا ___ اور وہ اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنسنے لگے ___

جب وہ سرنگ سے باہر نکلے تو جھیل کا پانی پر سکون تھا ___ شاید مگرمچھ کا پیٹ بھر چکا تھا ___

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود ، فاروق ، فرزانہ

اور ___ انسپکٹر جمشید سیریز ۵۶

پُر اسرار مہم

مصنف : اشتیاق احمد

- انسپکٹر جمشید کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجی ___
- گھنٹی کا انداز انجانا تھا ___
- آپ کے کردار ان دنوں چھٹیاں گزار رہے تھے ___
- وزیرِ دفاع نے انھیں دعوت پر بُلایا ___
- صدرِ مملکت بھی دعوت میں شریک تھے ___
- ٹامور سے ملیے ___
- انھیں ایک پُر اسرار مہم پر روانہ ہونا پڑا ___
- اور پھر آپ کے کردار اُلجھتے چلے گئے ___
- ۲۰ اگست کو پڑھیے ___ قیمت : ۱۵ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ

اور — انسپکٹر جمشید سیریز ۵۷

خونی کیمپ

مصنف: اشتیاق احمد

○ پُراسرار مہم آپ کے کرداروں کو خونی کیمپ تک لے گئی —
○ فرزانہ کے پیر میں موچ آگئی —
○ انسپکٹر جمشید اور ٹامور فرزانہ کو لنگڑاتے دیکھ کر گھبرا گئے —
○ انوراکا سے ملیے — وہ اس ملک کا خوف ناک ترین آدمی تھا —
○ انھیں ایک کاغذ پر لکھی تحریر نے ساکت کر دیا —
○ انوراکا نے انسپکٹر جمشید کو ایک زبردست دھمکی دی —
○ انتہائی جوڑ توڑ والا ناول —
○ یہ کہانی آپ کو مدتوں یاد رہے گی —
○ ۲۰ اگست کو پڑھیے — قیمت: ۱۵ روپے —

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ

اور — انسپکٹر جمشید سیریز ۵۸

نیلا عذاب

مصنف: اشتیاق احمد

○ نیلے لباس والے کی جیب میں ایک نیلا لفافہ تھا، لیکن اچانک وہ لفافہ جیب سے اڑا لیا گیا —
○ لفافہ اڑانے والے کو محمود نے صاف دیکھا تھا —
○ محمود نے فاروق کے ذمے ایک عجیب کام لگایا —
○ ہوٹل کی دوسری منزل سے فرزانہ نے ایک ہولناک منظر دیکھا اور کانپ اٹھی —
○ ایک پُراسرار سڑک جس پر گاڑیاں دھنس جاتی تھیں —
○ ایک عجوبہ ناول —
○ ۲۰ اگست کو پڑھیے — قیمت: ۱۵ روپے —